

# اسلامی تحریک درپیش چیلنج

پروفیسر خورشید احمد

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد



بسم الله الرحمن الرحيم

اسلامی تحریک: درپیش چیلنج

# اسلامی تحریک درپیش چیلنج

پروفیسر خورشید احمد

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز - اسلام آباد

---

جملہ حقوق محفوظ

طبع اول دسمبر ۱۹۹۳ء  
طبع دوم مئی ۱۹۹۵ء

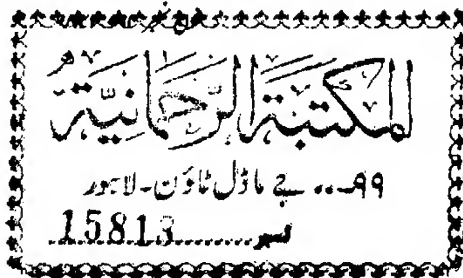
286  
1-102

کتاب: اسلامی تحریک: درپیش چیلنج  
مصنف: پروفیسر خورشید احمد

اہتمام: انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز  
بلاک ۱۹، مرکز ایف سیون اسلام آباد  
فون: ۸۱۸۲۳۰ فیکس: ۸۲۳۷۰۳

طابع: شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

تقسیم کنندہ: بک پروموترز، جناح سپر مارکیٹ  
مرکز ایف سیون، اسلام آباد



قیمت: ۳۰ روپے

## مندرجات

آغاز

۷

حصہ اول

نیو ورلڈ آرڈر کا چیلنج اور اسلام

- ۱۲ • مسلم دنیا: کل اور آج
- ۱۵ • بنیاد پرستی کا ہوا
- ۱۶ • مغرب کے دوہرے معیار اور اسلام
- ۱۹ • اسلام اور جمہوریت
- ۲۱ • اسلامی احیاء اور نیو ورلڈ آرڈر

حصہ دوم

اسلامی احیاء، بنیاد پرستی اور اسلامی تحریک

- ۳۱ • بنیاد پرستی اور اسلامی تحریک
- ۳۴ • مسلم سوسائٹی کا انحطاط اور اسلامی تحریک

اپنی موجودہ شکل میں یہ مجموعہ ان شاء اللہ بہت سے سوالوں کے جواب تلاش کرنے میں معاون ہوگا، جنہیں مغرب کی تقریاتی یلغار نے ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں میں پیدا کر دیا ہے۔ اس موقع پر میں انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز میں اپنے رفقاء کے کار کا مسنون ہوں، جنہوں نے اس تالیف و ترتیب میں معاونت کی۔ انگریزی مضمون کا ترجمہ برادر م سہاوی خان نے کیا اور جس پر تقرثانی برادر م ڈاکٹر سفیر اختر (مدیرہ "عالم اسلام اور عیسائیت") نے کی ہے۔ برادر م خالد رحمن اور برادر م سلیم منصور خالد نے کتاب کی تیاری اور تقرثانی میں مدد فرمائی ہے۔ شعبہ کمپیوٹر نے اسے کتابت کے دشوار عمل سے بے نیاز کیا اور اب یہ مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اگر آج کے عالمی حالات اور تہذیبی اور سیاسی چیلنج کے پس منظر میں اس مجموعہ سے اسلامی تحریک کے موقف کو سمجھنے میں قارئین کو کچھ مدد ملے تو یہ میرے لیے باعث سعادت ہوگا۔

خود شید احمد

۱۷ دسمبر ۱۹۹۳ء

حصہ اول

نیو ورلڈ آرڈر کا چیلنج اور اسلام

دنیا بھر کے ایک ارب سے زائد مسلمانوں کے لیے "نیو ورلڈ آرڈر" (نیا عالمی نظام) جنم لینے سے پہلے ہی ختم ہو چکا ہے \*۔ بیسویں صدی نے بہت سے رہنماؤں کو ایک نئے عالمی نظام کے بارے میں باتیں کرتے دیکھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد امریکی صدر وڈروئلن نے مستقبل کے عالمی نظام کے موضوع پر مباحثے میں جان ڈالنے کی کوشش کی۔ انہوں نے ایک ایسی دنیا کا خواب دیکھا جس میں کچھ اصولوں اور تسلیم شدہ آفاقی قدروں کی حکمرانی کا تصور تھا۔ یہ خواب "جلس اقوام" (لیگ آف نیشنز) کی تاحص ساخت اور اس کے فوری حاتمے کے ساتھ بکھر گیا۔ دنیا نہ ایک نئی جنگ سے بچ سکی اور نہ جمہوریت ہی محفوظ رہی بلکہ دنیا "دائیں" اور "بائیں" بازو کی کلیت پسندی کے زخے میں گھر گئی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ایک بار پھر نئی امیدیں پروان چڑھنے لگیں۔ اقوام متحدہ کی بنیاد رکھی گئی اور ایک نئے عہد کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔ مگر بہت جلد یہ امیدیں بھی خاک میں مل گئیں اور لسل السانی تباہ کن سرد جنگ کے دور میں داخل ہو گئی جو چار دہائیوں پر پھیلا ہوا ہے۔

۱

حالیہ برسوں میں "نئے عالمی نظام" کی تلاش میں تیزی آئی ہے۔ سرد جنگ کے مفروضہ اختتام پر سابق امریکی صدر جارج بش نے ۱۹۹۰ء کے آغاز میں ایک نئے عالمی نظام کی ضرورت پر زور دیا۔ کویت پر عراقی حملے اور امریکہ کی سرکردگی میں لڑی گئی طلیجی جنگ کو نئے عالمی نظام کا ابتدائیہ قرار دیا گیا۔ یہ دعویٰ کیا گیا کہ "مستقبل میں کوئی جارح اپنے کیے کی سزا پائے بغیر نہ

\* یہ مضمون امریکہ سے طامع ہونے والے جے ایچ ڈی ایف (شمارہ ۳ جلد ۱۹۹۳ء) میں طامع ہوا بعد ازاں اس کا کرد ترجمہ "عالم اسلام اور عیسائیت" (فروری ۱۹۹۳ء) ایسٹ ٹیٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد میں طامع ہوا۔



حصہ اول

نیو ورلڈ آرڈر کا چیلنج اور اسلام

دنیا بھر کے ایک ارب سے زائد مسلمانوں کے لیے "نیو ورلڈ آرڈر" (نیا عالمی نظام) جنم لینے سے پہلے ہی ختم ہو چکا ہے \*۔ بیسویں صدی نے بہت سے رہنماؤں کو ایک نئے عالمی نظام کے بارے میں باتیں کرتے دیکھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد امریکی صدر وڈروئلن نے مستقبل کے عالمی نظام کے موضوع پر مباحثے میں جان ڈالنے کی کوشش کی۔ انہوں نے ایک ایسی دنیا کا خواب دیکھا جس میں کچھ اصولوں اور تسلیم شدہ آفاقی قدروں کی حکمرانی کا تصور تھا۔ یہ خواب "جلس اقوام" (لیگ آف نیشنز) کی تاحص ساخت اور اس کے فوری عاتے کے ساتھ بکھر گیا۔ دنیا نہ ایک نئی جنگ سے بچ سکی اور نہ جمہوریت ہی محفوظ رہی بلکہ دنیا "دائیں" اور "بائیں" بازو کی کلیت پسندی کے زغے میں گھر گئی۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ایک بار پھر نئی امیدیں پروان چڑھنے لگیں۔ اقوام متحدہ کی بنیاد رکھی گئی اور ایک نئے عہد کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔ مگر بہت جلد یہ امیدیں بھی خاک میں مل گئیں اور لسل السانی تباہ کن سرد جنگ کے دور میں داخل ہو گئی جو چار دہائیوں پر پھیلا ہوا ہے۔

۱

حالیہ برسوں میں "نئے عالمی نظام" کی تلاش میں تیزی آئی ہے۔ سرد جنگ کے مفروضہ اختتام پر سابق امریکی صدر جارج بش نے ۱۹۹۰ء کے آغاز میں ایک نئے عالمی نظام کی ضرورت پر زور دیا۔ کویت پر عراقی حملے اور امریکہ کی سرکردگی میں لڑی گئی طلیجی جنگ کو نئے عالمی نظام کا ابتدائیہ قرار دیا گیا۔ یہ دعویٰ کیا گیا کہ "مستقبل میں کوئی جارح اپنے کیے کی سزا پائے بغیر نہ

\* یہ مضمون امریکہ سے خارج ہونے والے پبلک ایشن افٹرز برٹل (شمارہ ۳ جلد ۱۹۹۳ء) میں خارج ہوا بعد ازاں اس کا کرد ترجمہ "عالم اسلام اور عیسائیت" (فروری ۱۹۹۳ء) الٹنی ٹیٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد میں شائع ہوا۔

رہے گا" اور "طاقت کے بل بوتے پر کسی کا قبضہ برداشت نہیں کیا جائے گا۔ مزید کہا گیا کہ "بین الاقوامی سرحدوں میں یک طرفہ طور پر رد و بدل کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ سب کو انسانی حقوق کی پابندی کرنا پڑے گی"، اور "یہ امر بھی یقینی بنایا جائے گا کہ قومی سرحدوں کی پروا کیے بغیر انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں کا خاتمہ ہو سکے"، اور "اقوام متحدہ دنیا میں امن قائم رکھنے کے لیے ایک نیا کردار ادا کرے گی۔" ان اصولوں کے تعین کے ساتھ یہ باور کر لیا گیا کہ اب لسل انسانی جمہوریت اور سلامتی کے ایک نئے دور میں داخل ہو جائے گی۔

ان اعلیٰ مقاصد کے ساتھ کے اتفاق نہیں ہو گا؟ تاہم سوال یہ ہے کہ وہ قومیں جو آج کی دنیا میں سیاسی لحاظ سے طاقتور ہیں، کیا وہ ان مقاصد کے سلسلے میں سنجیدہ ہیں یا وہ محض اپنے مخصوص سامراجی مفادات کو آگے بڑھانے کے لیے ان اصولوں کو استعمال کرنے میں دلچسپی رکھتی ہیں؟ یہ انتہائی بنیادی اور اہم سوال ہے۔

۲

## مسلم دنیا — کل اور آج

آج مسلمان دنیا کی کل آبادی کا پانچواں حصہ ہیں۔ دنیا بھر میں ان کی تعداد تقریباً ایک ارب ۲۰ کروڑ ہے۔ ۵۳ آزاد مسلم مملکتوں میں ۸۰ کروڑ مسلمان رہتے ہیں۔ یہ مسلم مملکتیں دنیا کے ۲۳ فیصد رقبے پر محیط ہیں۔ اگرچہ مسلم آبادی مشرقی اور وسطی یورپ میں بھی ہے، تاہم البانیہ میں مسلمانوں کی تعداد ۳۷ فیصد ہے۔ جبکہ بوسنیا ہرزیگووینا میں یہ قابل لحاظ تعداد میں موجود ہیں۔ دنیا کے دیگر حصوں میں بھی مسلمان بھاری تعداد میں آباد ہیں، بالخصوص یورپ اور امریکہ میں، جہاں اسلام، عیسائیت کے بعد دوسرا بڑا مذہب ہے۔

تاہم اسلام ایک ایسا مذہب ہے جس کے بارے میں مغرب میں سب سے زیادہ غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ ایک ایسا مذہب جو امن اور انصاف کا علمبردار ہے، اسے جنگ اور جنونیت کے مذہب کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہزار سال سے زائد کے عرصے میں مسلمان دنیا میں نہ صرف ایک غالب قوت رہے ہیں، بلکہ اسلامی تہذیب اور معاشرے نے غیر مسلموں سمیت سب کو امن اور تحفظ فراہم کیا۔ حقیقت میں یہ مسلم دنیا ہی تھی جو ان تمام لوگوں کے لیے پناہ گاہ اور گائے امن رہی، جنہیں دنیا کے مختلف حصوں، بالخصوص

یورپ میں متحدہ کالٹانہ بنایا گیا۔

رابرٹ بریفلٹ، مسلم ریاست اور معاشرے، جو برمی حد تک اسلام پر مبنی تھے، اس کے ریکارڈ کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

مشرق میں تھیا کر یہی فکری لحاظ سے ظالم اور جاہل نہیں تھی۔ ہم وہاں اہسام اور محمود صوح پر پابندی اور فکری اختلاف کے خلاف مسلسل جنگ کا جھنڈ نہیں پاتے، جو یورپی دنیا کی معروف خصوصیت ہے اور جے یونان اور روم کی پشت پناہی حاصل تھی۔

تاریخ دان میور (Muir) واضح الفاظ میں رقم طراز ہے کہ:

مفتوحین کے ساتھ [مسلمانوں کی] نرم روی، ان کا انصاف اور دیانتداری، رومنوں کے ظلم و تشدد اور عدم رواداری کے مقابلے میں ایک متضاد تصور پیش کرتی ہے۔ شامی عیسائیوں کو عرب فاتحین کے تحت اس سے کہیں زیادہ شہری آزادی حاصل تھی، جتنی انہیں ہرکولیس کے اقتدار میں حاصل تھی، اور انہیں اپنی سابقہ حالت میں لوٹ جانے کی کوئی خواہش نہیں تھی۔

یہ ہے انسانی تاریخ میں مسلمانوں کا ریکارڈ۔

گزشتہ تین صدیوں کے دوران میں صورت حال میں ٹھوس تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ اس عرصے میں مغربی استعماری طاقتیں دنیا پر حکمران رہی ہیں اور مسلم دنیا ہمیشہ جمہوری مغربی ملکوں کے زیر تسلط رہی ہے۔ اس دور میں تیسری دنیا کی اقوام اور عوام کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص استعماری طاقتوں کے ہاتھوں کئی انداز میں نقصان اٹھانا پڑا۔ مشہور مؤرخ اور فلسفی آرئلڈ ٹائٹن بی نے مغرب کے ساتھ دنیا کے تعلقات پر برمی خوبصورتی کے ساتھ مندرجہ ذیل الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

دنیا اور مغرب کے درمیان تعلقات میں، جو گزشتہ چار پانچ سو سال سے بڑھ کر ہے ہیں، مغرب نہیں بلکہ دنیا ہی اب تک وہ فریق ہے جسے سخت تجربے سے واسطہ پڑا ہے۔ یہ مغرب نہیں، جس پر دنیا کی ضرب پڑی ہے، بلکہ یہ دنیا ہے جسے مغرب کی چوٹ برداشت کرنی پڑی ہے اور یہ چوٹ بہت سخت ہے۔ دنیا کھجے گی

1. Robert Briffault "The Making of Humanity" pp113.

2. Muir "The Caliphate: Its Rise, Decline and Fall", p 128.

کرتے ہوئے خارج اور مظلوم کے درمیان ایک معاہدہ کرادیں، تاکہ خارج نے جو کچھ طاقت کے اندھے استعمال سے حاصل کیا ہے، اسے سند جواز حاصل ہو جائے۔ جب مظلوم یوسنیائی مسلمان اپنے دفاع کے لیے امداد اور ہتھیار حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تو ان کے راستے میں اقوام متحدہ کی پابندیاں حائل ہو جاتی ہیں۔ اگر اتفاق سے کچھ ہمدرد "مذہب" رکاوٹوں کو عبور کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، تو انہیں جنونی اور بنیاد پرست قرار دے دیا جاتا ہے۔ مسلم احمیاء اور اس کی رفتار کو "جنونیت" اور "بنیاد پرستی" کہہ دینے سے روکا نہیں جاسکتا۔ اس سے اور تو کچھ نہیں ہوگا، صرف مسلم عوام کی نظروں میں مغربی قیادت کا اعتماد ہی مجروح ہوگا۔

مغرب کو مسلمانوں سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ اس قسم کے کوئی آثار نہیں، بلکہ اس بات کا دور دورہ تک کوئی امکان نہیں ہے کہ مسلمان مہلح ہو کر مغرب پر دھاوا بول دیں یا وہ مغرب کے سیاسی نظام کے لیے کسی قسم کا خطرہ بن جائیں۔ مسلمان محض اپنے معاملات درست کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ اپنی اقدار اور تصورات کے مطابق لہٰذا انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کو سنوارنے کا حق چاہتے ہیں۔ اسلامی احمیاء کی تحریکیں جدت (Modernization) سے الگ نہیں ہیں۔ وہ جدت طرازی اور مادی ترقی کی حامی ہیں، لیکن یہ جدت اور ترقی وہ لہٰذا ثقافت اور اقدار کے تناظر میں حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ یہ تحریکیں اس بات کو بر گز پسند نہیں کرتیں کہ ایک روشن تہذیب اور ثقافت کی حامل قوم پر کھلم کھلا یا ڈھکے چھپے ہتھکنڈوں سے مغربی تہذیب اور اس کی اقدار مسلط کر دی جائیں۔

اقتصادی یا ثقافتی استعمار بھی اتنا ہی بُرا اور تباہ کن ہے جتنا کہ سیاسی استعمار۔ دنیا زندگی بسر کرنے کے لیے صرف اسی صورت میں محفوظ جگہ بن سکتی ہے، جب تمام قومیں اور عوام یہ اصول تسلیم کر لیں کہ ان میں سے ہر ایک کو اپنا مستقبل اپنے نظریات اور اصولوں کے مطابق تشکیل کرنے کا حق حاصل ہے۔ خیالات کا آزادانہ مکالمہ ہونا چاہیے، مگر کسی مجموعہ اقدار، ثقافت یا نظام کو دوسروں پر طاقت کے زور سے مسلط کرنے سے اجتناب کیا جانا چاہیے۔ زندگی کی بوقلمونی اور ثقافتی و نظریاتی تنوع کو حقیقی اور جائز تسلیم کرنے سے ہی مختلف اقوام اور عوام ایک دوسرے کے ساتھ امن اور دوستی کی فضا میں رہ سکتے ہیں۔

مسلم عوام کسی خاص ملک کی، چاہے وہ اقتصادی یا فوجی لحاظ سے کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو، بالادستی تسلیم نہیں کرتے۔ چھوٹی قومیں اور کمزور ممالک بھی زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کا حق رکھتے ہیں۔ امریکی بالادستی (Pax-Americana) بھی اتنی ہی ٹھنڈی چیز ہے، جتنی کہ

برطانوی بالادستی (Pax-Britainica) یا ہسپانوی بالادستی۔ یک قطبی (Uni-polar) دنیا یا ایک عالمی طاقت کی باتیں نے خوف اور خدشات کو جنم دے رہی ہیں اور ایک نیا استعماری نظام ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔ کوئی منصفانہ عالمی نظام کسی ایک کی بالادستی پر مبنی کارروائیوں کے ذریعے وجود میں نہیں لایا جاسکتا۔

مسلم عوام اور تیسری دنیا کی اقوام نئی بالادستی کو کبھی قبل نہ کریں گی۔ چھوٹی اور بڑی، غریب اور امیر، کمزور اور طاقت ور سب اقوام کو جینے اور اپنی اقدار اور معیارات کے مطابق زندہ رہنے کا مساوی حق حاصل ہے۔ سب کو پھولنے پھلنے کے برابر کے مواقع ملنے چاہیں۔ کسی کی طرف سے دوسروں پر اپنی بالادستی کا تسلط ہی بین الاقوامی کشیدگی اور تصادم کی جڑ ہے۔ اگر مغرب انسانیت کو ایک منصفانہ عالمی نظام کی جانب پیش رفت میں مدد فراہم کرنے کے سلسلے میں واقعی سنجیدہ ہے، تو اسے ذرا زیادہ خود احتسابی سے بھی کام لینا چاہیے۔

## ۵

### اسلام اور جمہوریت

یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ "اسلام جمہوریت کے خلاف ہے"۔ اس مفروضے کی بنیاد سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ جمہوریت، فلسفیانہ سطح پر، انسان کی حاکمیت اعلیٰ کا اصول تسلیم کرتی ہے، نیز ابدی اور حتمی مذہبی یا اخلاقی قدروں سے انکار کرتی ہے۔ جمہوریت کا یہ فلسفیانہ تصور دنیا اور معاشرے کے سلسلے میں اسلامی نظریے سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اسلام خدا کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کرتا ہے اور اس بات میں یقین رکھتا ہے کہ انسان کو الہی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ مسلمان سمجھا ہی اس شخص کو جانتا ہے جو الہی قانون کو اپنے انفرادی اور اجتماعی رویے کا سرچشمہ تسلیم کرتا ہے۔ لیکن اس سے یہ اخذ کرنا کہ اسلام میں جمہوریت کا سرے سے کوئی وجود نہیں، غلط فہمی یا دالستہ مغالطہ انگیزی کے سوا کچھ نہیں۔ اسلام نے انسانی نیابت (خلافت) کا تصور پیش کیا ہے۔ یہ خلافت بحیثیت مجموعی عوام کو حاصل ہے، یہ کسی ایک گروہ یا طبقے یا خاندان تک محدود نہیں۔ الہی قانون اس کے لیے دائرہ کار فراہم کرتا ہے۔ اس نظام قانون میں لچک اور تبدیلی کی وسیع گنجائش ہے جو "مباح" کے ذیل میں آتی ہے۔ کتاب اللہ کی تفسیر و تعبیر کا حق ہر اس شخص کے لیے ہے جو علم رکھتا ہے اور جس میں اس کی تفہیم و تعبیر کی صلاحیت موجود

ہے۔ اسلام کے قانونی نظام کے دائرہ کار میں اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے۔  
اسلام میں حکمرانی کا اختیار کسی کو اس کے مذہبی منصب کی بنیاد پر نہیں دیا گیا۔  
معاشرے کے تمام افراد کا نہ صرف یہ حق، بلکہ فرض ہے کہ وہ اقتدار کی باگ ڈور ان افراد کے  
حوالے کریں جن پر انہیں اعتماد ہے۔ سیاسی قیادت عوام اور خدا کے سامنے براہ راست جوابدہ  
ہے۔ اسلام کے سیاسی نظام میں قانون کی حکمرانی ہے اور اس میں اقلیتوں منیت معاشرے  
کے تمام ارکان کے بنیادی حقوق کے تحفظ کا اصول موجود ہے۔ حکومت کے جوابدہ ہونے کا  
تصور اسلامی نظام میں اہم حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح قیادت کا عوام کی مرضی سے انتخاب اور  
اس کی برخواسی مسئلہ اصول ہے، اور یہی بات اختلاف رائے اور عدم اتفاق کے سلسلے میں  
درست ہے۔

عملی سطح پر اسلام کا سیاسی نظام ان اصولوں پر مبنی ہے اور اس طرح جمہوری عمل کو اس  
میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اسلام سیاسی میدان میں جن مقاصد کے حصول کا خواہش مند  
ہے، انہیں مسلم دنیا کی بعض حکومتوں کے طور طریقوں کے ساتھ گڈ مڈ نہ کیا جانا چاہیے، چاہے  
وہ اسلام کا نام ہی کیوں نہ استعمال کرتی ہوں۔ یہ سب کچھ معاصر دنیا میں جمہوریت کی ناگوار  
صورت حال کے قریب قریب ہے۔ بہت سے جمہوریت کے دعویدار حقیقت میں جمہوری  
اصولوں کی پاسداری نہیں کر رہے۔ اس انحراف کو جمہوریت کی ناکامی پر محمول نہ کیا جانا چاہیے،  
بلکہ اسے محض کچھ لوگوں یا ملکوں کا انحراف خیال کرنا چاہیے۔

اگر اسلامی جمہوری نظام کو اس پس منظر میں دیکھا جائے تو اسے الہی تعلیمات پر مبنی  
جمہوری نظام سمجھا جانا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ سرکردہ مسلم مفکر سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳ء -  
۱۹۷۹ء) نے اسلام کے سیاسی نظام کو "الہی جمہوری" (Theo - democratic) قرار دیا  
ہے۔ اسلام میں تصویروں کی کوئی گنجائش نہیں، کیونکہ تصویروں میں ایک مخصوص مذہبی  
گروہ کو مذہبی قانون کی تعبیر کا حق حاصل ہوتا ہے اور وہی گروہ سیاسی طاقت کا مالک ہوتا ہے۔  
اسلام ایسے کسی بھی مذہبی انتظام کی حمایت نہیں کرتا۔ اس کے برعکس اسلام قانون کی حکمرانی  
اور قانون کی نظر میں سب کے مساوی ہونے پر زور دیتا ہے۔ یہ جواب دہی کے اصول اور عوام کی  
مرضی سے حکومت کی تبدیلی اور تشکیل کا علم بردار ہے۔ آج مسلمانوں کو اس بات پر بجا طور پر

۶۔ دیکھئے: سید ابوالاعلیٰ مودودی "اسلامی ریاست" (مرتب، خورشید احمد) اسلامک پبلی کیشنز، لاہور۔

تشویش ہے کہ اسلام ایک طرف جمہوریت مخالف نظریے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے، اور دوسری طرف جمہوری عمل سے ابھرنے والی اسلامی قوتوں کو اپنے ہی ملکوں میں برسرِ اقتدار آنے کے حق سے محروم کیا جا رہا ہے، جیسا کہ حال ہی میں الجزائر میں ہوا ہے اور اسلامی جمہوری قوتوں کا راستہ روکنے والوں کو مغرب کی پوری تائید حاصل ہے۔

۶

اسلامی احیاء اور "نیو ورلڈ آرڈر"

آج کے مسلم ذہن کو سمجھنے کے لیے اسلامی احیاء کے بعض اہم پہلوؤں کا جائزہ فائدے سے خالی نہ ہوگا۔ مسلمان ایک نئے مضبوط عالمی نظام کے وجود میں آنے کے حقدار سے مستحق ہیں، نہ کہ محض نئے عالمی نظام کے، جس میں کسی ایک ملک کی بالادستی مقصود ہو۔ اسلامی احیاء نہ صرف منفرد ہے بلکہ عالمگیر بھی ہے۔ اسلام میں تنوع کے ساتھ وحدت ہے، اور یہ تنوع انفرادیت کو مجروح نہیں کرتا۔ اسلام ایک عالمگیر دین ہے۔ اس میں "عرب اسلام"، "پاکستانی اسلام"، "ایرانی اسلام" یا "ترک اسلام" نام کی کوئی چیز نہیں ہے، تاہم اسلامی عالمگیریت میں وحدت ہے، یکسانیت نہیں۔

اسلام میں بعض نمایاں پہلو ہیں جو ہر جگہ مشترک ہیں۔ لیکن اس سے تحریک کی زرخیزی متاثر نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر عربی، قرآن اور پیغمبر اسلام ﷺ کی زبان ہے، لیکن یہ لازمی طور پر تمام مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ اگرچہ ہر ایک مسلمان کچھ نہ کچھ عربی زبان سیکھتا ہے لیکن دیگر زبانیں بولنا اور انہیں ایسے تصورات کو پروان چڑھانے کے لیے، جو اسلامی روایات سے مطابقت رکھتے ہوں، بطور آہ استعمال کرنا کچھ کم اسلامی نہیں ہے۔

مسلمان اپنا اعتقاد خود کرتے ہیں۔ وہ سماجی زندگی کے سطحی مظاہر کا جائزہ لیتے رہتے ہیں اور قرآن و سنت میں بیان کردہ بنیادی اصولوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس عمل میں ان علامات مثلاً بعض مخصوص رسوم یا فقہی ضوابط کی بعض تفصیل وغیرہ سے سبے پروائی بھی شامل ہو سکتی ہے، جو مذہبی روایات کا حصہ بن چکی ہیں۔ حالیہ تحریک احیاء اسلام کی بنیادی روح یہی "اصل کی جانب رجوع" ہے۔ بنیادی منابع کی جانب رجوع ایک آزادی بخش قوت ہے۔ اسلام میں اس سے ایک متحرک عمل کا آغاز ہوتا ہے۔ بنیادی منابع کی جانب رجوع "بنیاد پرستی" کو



کرتے ہوئے خارج اور مظلوم کے درمیان ایک معاہدہ کرادیں، تاکہ خارج نے جو کچھ طاقت کے اندھے استعمال سے حاصل کیا ہے، اسے سند جواز حاصل ہو جائے۔ جب مظلوم یوسنیائی مسلمان اپنے دفاع کے لیے امداد اور ہتھیار حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تو ان کے راستے میں اقوام متحدہ کی پابندیاں حائل ہو جاتی ہیں۔ اگر اتفاق سے کچھ ہمدرد "مذہب" رکاوٹوں کو عبور کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، تو انہیں جنونی اور بنیاد پرست قرار دے دیا جاتا ہے۔ مسلم احمیاء اور اس کی رفتار کو "جنونیت" اور "بنیاد پرستی" کہہ دینے سے روکا نہیں جاسکتا۔ اس سے اور تو کچھ نہیں ہوگا، صرف مسلم عوام کی نظروں میں مغربی قیادت کا اعتماد ہی مجروح ہوگا۔

مغرب کو مسلمانوں سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ اس قسم کے کوئی آثار نہیں، بلکہ اس بات کا دور دورہ تک کوئی امکان نہیں ہے کہ مسلمان مہلج ہو کر مغرب پر دھاوا بول دیں یا وہ مغرب کے سیاسی نظام کے لیے کسی قسم کا خطرہ بن جائیں۔ مسلمان محض اپنے معاملات درست کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ اپنی اقدار اور تصورات کے مطابق لہسنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں سنوارنے کا حق چاہتے ہیں۔ اسلامی احمیاء کی تحریکیں جدت (Modernization) سے الرجک نہیں ہیں۔ وہ جدت طرازی اور مادی ترقی کی حامی ہیں، لیکن یہ جدت اور ترقی وہ لہسنی ثقافت اور اقدار کے تناظر میں حاصل کرنا چاہتی ہیں۔ یہ تحریکیں اس بات کو بر گز پسند نہیں کرتیں کہ ایک روشن تہذیب اور ثقافت کی حامل قوم پر کھلم کھلا یا ڈھکے چھپے ہتھکنڈوں سے مغربی تہذیب اور اس کی اقدار مسلط کر دی جائیں۔

اقتصادی یا ثقافتی استعمار بھی اتنا ہی بُرا اور تباہ کن ہے جتنا کہ سیاسی استعمار۔ دنیا زندگی بسر کرنے کے لیے صرف اسی صورت میں محفوظ جگہ بن سکتی ہے، جب تمام قومیں اور عوام یہ اصول تسلیم کر لیں کہ ان میں سے ہر ایک کو اپنا مستقبل اپنے نظریات اور اصولوں کے مطابق تشکیل کرنے کا حق حاصل ہے۔ خیالات کا آزادانہ مکالمہ ہونا چاہیے، مگر کسی مجموعہ اقدار، ثقافت یا نظام کو دوسروں پر طاقت کے زور سے مسلط کرنے سے اجتناب کیا جانا چاہیے۔ زندگی کی بوقلمونی اور ثقافتی و نظریاتی تنوع کو حقیقی اور جائز تسلیم کرنے سے ہی مختلف اقوام اور عوام ایک دوسرے کے ساتھ امن اور دوستی کی فضا میں رہ سکتے ہیں۔

مسلم عوام کسی خاص ملک کی، چاہے وہ اقتصادی یا فوجی لحاظ سے کتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو، بالادستی تسلیم نہیں کرتے۔ چھوٹی قومیں اور کمزور ممالک بھی زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کا حق رکھتے ہیں۔ امریکی بالادستی (Pax-Americana) بھی اتنی ہی ٹھنڈی چیز ہے، جتنی کہ

برطانوی بالادستی (Pax-Britainica) یا ہسپانوی بالادستی۔ یک قطبی (Uni-polar) دنیا یا ایک عالمی طاقت کی باتیں نے خوف اور خدشات کو جنم دے رہی ہیں اور ایک نیا استعماری نظام ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔ کوئی منصفانہ عالمی نظام کسی ایک کی بالادستی پر مبنی کارروائیوں کے ذریعے وجود میں نہیں لایا جاسکتا۔

مسلم عوام اور تیسری دنیا کی اقوام نئی بالادستی کو کبھی قبل نہ کریں گی۔ چھوٹی اور بڑی، غریب اور امیر، کمزور اور طاقت ور سب اقوام کو جینے اور اپنی اقدار اور معیارات کے مطابق زندہ رہنے کا مساوی حق حاصل ہے۔ سب کو پھولنے پھلنے کے برابر کے مواقع ملنے چاہیں۔ کسی کی طرف سے دوسروں پر اپنی بالادستی کا تسلط ہی بین الاقوامی کشیدگی اور تصادم کی جڑ ہے۔ اگر مغرب انسانیت کو ایک منصفانہ عالمی نظام کی جانب پیش رفت میں مدد فراہم کرنے کے سلسلے میں واقعی سنجیدہ ہے، تو اسے ذرا زیادہ خود احتسابی سے بھی کام لینا چاہیے۔

## ۵

### اسلام اور جمہوریت

یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ "اسلام جمہوریت کے خلاف ہے"۔ اس مفروضے کی بنیاد سراسر غلط فہمی پر مبنی ہے۔ جمہوریت، فلسفیانہ سطح پر، انسان کی حاکمیت اعلیٰ کا اصول تسلیم کرتی ہے، نیز ابدی اور حتمی مذہبی یا اخلاقی قدروں سے انکار کرتی ہے۔ جمہوریت کا یہ فلسفیانہ تصور دنیا اور معاشرے کے سلسلے میں اسلامی نظریے سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اسلام خدا کی حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کرتا ہے اور اس بات میں یقین رکھتا ہے کہ انسان کو الہی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ مسلمان سمجھا ہی اس شخص کو جانتا ہے جو الہی قانون کو اپنے انفرادی اور اجتماعی رویے کا سرچشمہ تسلیم کرتا ہے۔ لیکن اس سے یہ اخذ کرنا کہ اسلام میں جمہوریت کا سرے سے کوئی وجود نہیں، غلط فہمی یا دالستہ مغالطہ انگیزی کے سوا کچھ نہیں۔ اسلام نے انسانی نیابت (خلافت) کا تصور پیش کیا ہے۔ یہ خلافت بحیثیت مجموعی عوام کو حاصل ہے، یہ کسی ایک گروہ یا طبقے یا خاندان تک محدود نہیں۔ الہی قانون اس کے لیے دائرہ کار فراہم کرتا ہے۔ اس نظام قانون میں لچک اور تبدیلی کی وسیع گنجائش ہے جو "مباح" کے ذیل میں آتی ہے۔ کتاب اللہ کی تفسیر و تعبیر کا حق ہر اس شخص کے لیے ہے جو علم رکھتا ہے اور جس میں اس کی تفہیم و تعبیر کی صلاحیت موجود

ہے۔ اسلام کے قانونی نظام کے دائرہ کار میں اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے۔  
اسلام میں حکمرانی کا اختیار کسی کو اس کے مذہبی منصب کی بنیاد پر نہیں دیا گیا۔  
معاشرے کے تمام افراد کا نہ صرف یہ حق، بلکہ فرض ہے کہ وہ اقتدار کی باگ ڈور ان افراد کے  
حوالے کریں جن پر انہیں اعتماد ہے۔ سیاسی قیادت عوام اور خدا کے سامنے براہ راست جوابدہ  
ہے۔ اسلام کے سیاسی نظام میں قانون کی حکمرانی ہے اور اس میں اقلیتوں منیت معاشرے  
کے تمام ارکان کے بنیادی حقوق کے تحفظ کا اصول موجود ہے۔ حکومت کے جوابدہ ہونے کا  
تصور اسلامی نظام میں اہم حیثیت رکھتا ہے۔ اسی طرح قیادت کا عوام کی مرضی سے انتخاب اور  
اس کی برخواسخی مسئلہ اصول ہے، اور یہی بات اختلاف رائے اور عدم اتفاق کے سلسلے میں  
درست ہے۔

عملی سطح پر اسلام کا سیاسی نظام ان اصولوں پر مبنی ہے اور اس طرح جمہوری عمل کو اس  
میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اسلام سیاسی میدان میں جن مقاصد کے حصول کا خواہش مند  
ہے، انہیں مسلم دنیا کی بعض حکومتوں کے طور طریقوں کے ساتھ گڈ مڈ نہ کیا جانا چاہیے، چاہے  
وہ اسلام کا نام ہی کیوں نہ استعمال کرتی ہوں۔ یہ سب کچھ معاصر دنیا میں جمہوریت کی ناگوار  
صورت حال کے قریب قریب ہے۔ بہت سے جمہوریت کے دعویدار حقیقت میں جمہوری  
اصولوں کی پاسداری نہیں کر رہے۔ اس انحراف کو جمہوریت کی ناکامی پر محمول نہ کیا جانا چاہیے،  
بلکہ اسے محض کچھ لوگوں یا ملکوں کا انحراف خیال کرنا چاہیے۔

اگر اسلامی جمہوری نظام کو اس پس منظر میں دیکھا جائے تو اسے الہی تعلیمات پر مبنی  
جمہوری نظام سمجھا جانا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ سرکردہ مسلم مفکر سید ابوالاعلیٰ مودودی (۱۹۰۳ء -  
۱۹۷۹ء) نے اسلام کے سیاسی نظام کو "الہی جمہوری" (Theo - democratic) قرار دیا  
ہے۔ اسلام میں تصویروں کی کوئی گنجائش نہیں، کیونکہ تصویروں میں ایک مخصوص مذہبی  
گروہ کو مذہبی قانون کی تعبیر کا حق حاصل ہوتا ہے اور وہی گروہ سیاسی طاقت کا مالک ہوتا ہے۔  
اسلام ایسے کسی بھی مذہبی انتظام کی حمایت نہیں کرتا۔ اس کے برعکس اسلام قانون کی حکمرانی  
اور قانون کی نظر میں سب کے مساوی ہونے پر زور دیتا ہے۔ یہ جواب دہی کے اصول اور عوام کی  
مرضی سے حکومت کی تبدیلی اور تشکیل کا علم بردار ہے۔ آج مسلمانوں کو اس بات پر بجا طور پر

۶۔ دیکھئے: سید ابوالاعلیٰ مودودی "اسلامی ریاست" (مرتب، خورشید احمد) اسلامک پبلی کیشنز، لاہور۔

اقوام کی بٹائے باہمی، بلکہ انہیں اپنی بٹاء میں مدد دینے کے لیے تیار ہیں؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو مستقبل روشن ہے۔ مسلم دنیا انسانیت کے روشن مستقبل کے لیے جدوجہد کرنا چاہتی ہے، تاہم اس کا زیادہ تر انحصار مغرب پر ہے کہ وہ اس چیلنج کے بارے میں کیا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے۔

www.iqbalkalmati.blogspot.com

حصہ دوم

اسلامی احیاء، بنیاد پرستی اور اسلامی تحریک

لیے کی جانے والی کوششوں کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے۔ یہ تفصیل، مسلم معاشرے کے جذبول کے بارے میں مصمیر لاعلمی پر مبنی ہے۔

اسی طرح اسلامی احیاء کو محض مغربی استعمار کے خلاف عوام کا غم و غصے سے بھرپور رد عمل قرار دینا بھی گمراہ کن ہے۔ استعمار کے خلاف رد عمل میں کوئی شک نہیں ہے، تاہم یہ رد عمل سیاسی طیش کے اظہار سے کمزیر زیادہ ہے۔ اس کی ایک زیادہ گہری وجہ ان تصورات، اقدار، حکومت کے نظام اور اداروں سے عدم اطمینان ہے، جو مغرب سے درآمد کر کے ان پر مسلط کیے گئے ہیں۔ ان کا یہ عدم اطمینان اپنی قیادت سے ہے، جسے وہ مغربی مفادات سے وابستہ خیال کرتے ہیں، اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ قیادت مغربی ترقی کے نمونوں اور اقدار کو مسلم معاشرہ پر مسلط کرنے کے لیے محض آلہ کار ہے۔ اس طرح یہ احیاء ایک ہمہ جہتی منظر ہے۔ ایک طرف یہ عوام کی امیگوں اور تاریخی آئینے میں مسلم تشویش کا اظہار ہے، جو حقیقتاً اندرونی اور مقامی عناصر پر مبنی ہے۔ دوسری جانب یہ بیرونی چیلنج کے خلاف رد عمل بھی ہے اور یہ چیلنج استعمار کے خاتمے پر مسلم معاشرے میں بیرونی مداخلت ہے۔

اسلامی احیاء کی تحریک موجودہ مسلم صورت حال کی ناقد ہے اور یہ ہمارے دور کے غالب کلچر، یعنی مغربی تہذیب و ثقافت کی بھی ناقد ہے جو اکثر ملکوں میں چھائی ہوئی ہے۔ یہ تنقید ایک مختلف بنیاد اور مختلف زاویہ نظر یعنی اسلام کے اصل مآخذوں — قرآن اور سنت — کے حوالے سے ہے۔

یہ تحریک ایمان کے احیاء کی نشاندہی کرتی ہے۔ اسلامی احیاء کی یہ جہت بیشتر مغربی تحریروں میں نظر انداز دکھائی دیتی ہے۔ وہ خیال کرتے ہیں کہ "یہ محض سیاسی اور سماجی ترتیب نو کا سوال ہے"۔ سماجی نظم یقیناً اہم ہے لیکن نکتہ آغاز ایمان کا احیاء اور اس کا استحکام ہے نیز فرد کی اخلاقی شخصیت اور اس کے کردار کی تعمیر نو ہے۔ روحانیت اور عینیت پسندی کا بے پناہ جذبہ ہے جو سمت کے لیے ایک نیا احساس ابھار رہا ہے اور لوگوں کو اپنی دنیا کی تعمیر نو پر آمادہ کر رہا ہے، چاہے اس کے لیے کوئی سی بھی قربانی دینی پڑے۔

استعماری دور میں اور اس کے بعد قیادت کا جو نمونہ سامنے آیا، اس میں ذاتی مفادات کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم معاشرہ اخلاقی قدروں سے اس قدر تہی دامن ہے اور بد عنوانیوں سے بھرا پڑا ہے۔ ہمارے ملکوں میں بد عنوانی اور استعمار طرز زندگی بن گیا ہے۔ مسلمانوں کی اپنی کمزوریاں ہیں اور انہیں عالمی صورت حال میں بہت دیکھ کر برداشت کرنے

پڑے ہیں، تاہم بدعنوانیوں کا موجودہ طوفان جو آج مسلم دنیا میں دیکھا جا رہا ہے، بالکل نئی صورت حال ہے۔ مسلمان اس صورت حال کو سیکولر ازم اور منفریت کے اثرات بتاتے ہیں۔ ان کے خیال میں انفرادی اور اجتماعی اخلاق جو توحید اور سنت رسول ﷺ سے وفاداری پر مبنی تھے، غیر ملکی اثرات کے زیر اثر کمزور پڑ گئے ہیں۔ "مسلم تہذیب پسندی" مسلم ممالک میں سیکولرزم کے نفوذ کی کوشش تھی، اس نے منفری لبرل ازم کی اقدار کو مسلم معاشرے پر اور سے تحوئے کی کوشش کی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ معاشرے پر رول دہی اقدار کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ لیکن اس خلا کو پُر کرنے کے لیے کوئی نئی اخلاقیات وجود میں نہ آ سکی۔ یہ وہ اخلاقی علاقہ ہے جس میں اقتصادی ترقی اور مادی خوش حالی کے نام پر ذاتی مفادات کے حصول، اپنی دولت میں اضافے اور سماجی و اقتصادی استحصال کی کوششیں عام ہو گئیں۔ اسلامی احیاء معاملات کی اس صورت حال کے خلاف بتاوت ہے۔ یہ اسلامی اخلاق کی بحالی اور امت کے مادی اور انسانی وسائل کو امت میں سماجی انصاف اور خود انصاری کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہے۔ مسلم نوجوان اسلام کے فراہم کردہ اصولوں اور سیرت رسول ﷺ کے مطابق اپنی انفرادی اور سماجی زندگی کی تعمیر نو کے جذبے سے سرشار ہیں۔ اور وہ نہ صرف ایک نیا سماجی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں، بلکہ وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ نیا عالمی نظام دنیا کے تمام پے ہوئے لوگوں کے لیے امن، وقار اور انصاف کا صائن بن کر ابھرے۔

آخر میں، میں یہ کہوں گا کہ اسلامی احیاء بنیادی طور پر مسلم معاشرے کی اندرونی، مقامی، مثبت اور لہریاتی تحریک ہے۔ یہ لازمی امر ہے کہ بین الاقوامی سطح پر اس کا دوسری قوتوں سے ربط ہو بلکہ مگر او بھی ممکن ہے۔ مسلمانوں کا مغرب کے ساتھ، بالخصوص نوآبادیاتی دور میں قربی ربط سمجھ میں آتا ہے، لیکن یہ اسلامی جوانی رویے کا سب سے زیادہ فیصلہ کن عنصر نہیں رہا۔

مسلمان اپنا سماجی اور اقتصادی نظام اسلامی اقدار کے مطابق استوار کرنا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کا ان قوتوں سے تصادم لازمی ہے جو موجودہ حالات (Status - quo) کو جوں کا توں برقرار رکھنے کے حق میں ہیں، اس لیے کشمکش ہوگی۔ اس سلسلے میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ منفری تہذیب پر مسلمانوں کی تنقید بنیادی طور پر سیاسی تصادم کی کوئی مشق نہیں ہے۔ حقیقی معرکہ دو ثقافتوں اور تہذیبوں کی سطح پر ہوگا۔ ایک تہذیب اسلامی اقدار پر مبنی ہوگی اور دوسری کی اساس مادیت، قومیت پرستی اور سیاسی و اقتصادی لبرل ازم پر ہوگی۔ اگر منفری ثقافت، عیسائیت، اخلاق کی مستقل اقدار اور ایمان پر مبنی ہوتی تو ربط یا مقابلے کی زبان اور طریق کار کی نوعیت



مختلف ہوتی، لیکن صورت حال یہ نہیں ہے۔ انتخاب، ”الہامی اصول“ اور ایک سیکولر مادی کچھ کے درمیان ہے، اور یہ ماننے کی کوئی وجہ نہیں ہے، کہ اس مقابلے کو تمام باشعور انسان محض مغرب اور مشرق کی جغرافیائی، سیاسی حد بندیوں یا عیسائیت بمقابلہ اسلام کے انداز میں دیکھیں گے۔ درحقیقت وہ تمام انسان، چاہے وہ دنیا کے کسی خطے میں رہتے ہوں، جنہیں ہمارے دور کے روحانی اور اخلاقی بحران پر تشویش ہے، وہ اسلامی احیاء پر اطمینان کا سانس لیں گے، نہ کہ وہ اس سے حائف ہوں گے۔

اقدار اور ثقافت کی سطح پر جاری تنازعے کی نوعیت واضح ہو جانے کے بعد میں یہ سمجھنا چاہوں گا کہ اس صورت حال کا ایک سیاسی پہلو بھی ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ مسلم احیاء میں کوئی مغرب مخالف جراثیم نہیں ہیں۔ مغربی ملکوں اور مسلم دنیا کے درمیان سیاسی تعلق کے حوالے سے یہ تحریک نہ تو مغرب کے حق میں ہے نہ اس کے خلاف، حالانکہ مسلم ممالک اور مغرب کے درمیان دور استعمار کی تلخ یادیں موجود ہیں جو تعلقات کو مبروح کرنے کے امکانات رکھتی ہیں۔ اگر چین اور امریکہ کسی مشترکہ ثقافت اور یکساں سیاسی و اقتصادی نظام کے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ دوستانہ تعلقات استوار کر سکتے ہیں، تو مغرب اور مسلم دنیا آپس میں ایسا کیوں نہیں کر سکتے؟ بہت حد تک اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ مغرب، اسلامی احیاء کو کن نظروں سے دیکھتا ہے اور اگر مسلم ذہن اور مسلم نقطہ نظر سے، مغربی طاقتیں، مسلم معاشرے پر مغربی ماڈل مسلط کرنے اور مسلمانوں کو قوی اور بین الاقوامی سطح پر مغربی غلبے کے نظام کے ساتھ وابستہ رکھنے اور مسلم کچھ اور سوسائٹی کو براہ راست یا بالواسطہ غیر مستحکم کرنے کی کوششیں جاری رکھتی ہیں تو ظاہر ہے کہ کشیدگی بڑھے گی، اور باہمی اختلافات میں کئی گنا اضافہ ہو جائے گا۔

اور اگر معاملات، مکالمے اور افہام و تفہیم کے ذریعے پُر امن طود پر، ایک دوسرے کے حقوق کے احترام کے جذبے سے حل نہ ہوتے، تو ان کا دوسرے طریقے سے حل ہونا ناگزیر ہے۔ دوسری طرف اگر ہم تسلیم اور اعتراف کریں کہ یہ ایک مختلف طرز کے معاشرہ کی دنیا ہے، مغربی کچھ دوسری ثقافتوں اور تہذیبوں کے ساتھ بٹانہ ان پر غلبہ پائے بغیر پھل پھول سکتا ہے، اور دوسرے لوگ لازمی طور پر دشمن نہیں ہیں، تو اس صورت میں اس بات کا حقیقی امکان ہے کہ ہم اختلاف رکھتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ رہنا سیکھ سکیں۔ اگر ہم اس نقطہ نظر کی پیروی کے لیے تیار ہیں تو ہم بہت سی مشترکہ بنیادیں اور مشترک چیلنج تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ یہی مستقبل کے عالمی نظام کی کلید ہے۔ کیا ہم تمام ثقافتوں، مذاہب اور

اقوام کی بٹائے باہمی، بلکہ انہیں اپنی بٹاء میں مدد دینے کے لیے تیار ہیں؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو مستقبل روشن ہے۔ مسلم دنیا انسانیت کے روشن مستقبل کے لیے جدوجہد کرنا چاہتی ہے، تاہم اس کا زیادہ تر انحصار مغرب پر ہے کہ وہ اس چیلنج کے بارے میں کیا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے۔

کے ظلم کو ٹوٹنا تھا، تاکہ لوگوں کو اسلام کی حقانیت اور اسلام کے قابل عمل ہونے کا یقین حاصل ہو۔ اور بظاہر پر دوسری فکری ان کو یہ دامن گیر تھی کہ مسلم سوسائٹی کی اعلیٰ قیادت، جس میں دانش ور، اہل قلم، اساتذہ، اور اہل حل و عقد آتے ہیں اس کو مخاطب کیا جائے۔ لیکن میرے خیال میں شاید ہم اس امر کا اندازہ نہ لگا سکے کہ ملک میں قیادت اور عوام کے درمیان تعلقات کار تبدیل ہو گئے ہیں۔ ہم ایک تبدیل شدہ صورت حال میں تھے۔ جتنا بھرپور چیلنج درپیش تھا، اس میں ہر حال جان جو محکم، جدوجہد، ایثار اور قربانی پر اسلامی تحریکوں کو ریڈٹ پیش کرتا ہوں کہ جو کام انہوں نے کیا وہ بڑا بنیادی اور غیر معمولی کام تھا۔ لیکن ساتھ ہی ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ کیا وجہ ہے کہ اس کے بعد پھر وہ کیفیت نہیں پیدا ہو سکی جس کے نتیجے کے طور پر مقابل کی ساری قوتوں کو قائل کر کے ساتھ چلا لیتے۔

یہ مثال اپنی جگہ غور و فکر کی دعوت دیتی ہے کہ اگر حضرت ابوذر غفاری اسلام قبول کرتے ہیں تو پورا قبیلہ ان کے ساتھ آجاتا ہے۔ اگر طائف کے سردار اسلام قبول کر لیتے ہیں تو پورا طائف محسن عالم ﷺ کی اطاعت قبول کر لیتا ہے۔ لیکن دوسری طرف مولانا شبیر احمد عثمانیؒ تو بلاشبہ آپ کے ساتھ آجاتے ہیں، مگر جمعیت العلماء نے ہند نہیں آتی۔ اس اعتبار سے سیاسی و سماجی قیادت اور فکری قیادت: اسلامی تحریکات ان دونوں سے آگے بڑھنے میں فیصلہ کن حد تک کامیاب نہیں رہیں۔ ابھی تک وہ اس کی Transformation کو مکمل نہیں کر سکیں۔ یہی چیز ایک دور ابا ہے کہ جس پر ہمارے عوام دل سے اسلام چاہتے ہیں لیکن نہ وہ یہ جانتے ہیں کہ اسلام کیا ہے اور نہ اخلاقی طور پر اس بات کے لیے تیار ہو سکے ہیں کہ اسلام جو مطالبات ان سے کرتا ہے اور جو تبدیلیاں وہ چاہتا ہے، انہیں اپنی زندگیوں میں لے آئیں۔ اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہمارا اصل بحران یہ ہے کہ بلاشبہ آج کا مسلمان اسلام کے لیے جان اور مال کی قربانی دینے کے لیے تیار ہے، لیکن اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ سود کھانے سے تو نہیں شرماتے، مگر سود کھانے سے ضرور نفرت کرتے ہیں۔ اسلامی تحریکوں کے لیے یہ ایک کھلا چیلنج اور گھمبیر سوال ضرور ہے۔

سوال: ہمارے یہاں اسلامی تحریکیں خواص کے دلوں کو اس انقلابی دعوت کی طرف نہیں پھیر سکیں۔ کیا اسلامی تحریکوں کی حکمت عملی میں کوئی خامی رہ گئی ہے؟

جواب: میں نے اس طرف ابھی اشارہ کیا ہے۔ اس وقت ہمارا سوسائٹی کا جو یادور سٹرکچر ہے اس کو ہم نہ تو اسلام کے حقیقی تصور اور تقاضوں پر عمل درآمد کے لیے قائل کر سکے ہیں اور نہ اسے بلا سکے ہیں اور نہ اس کی رکاوٹ کو پوری طرح عبور کر سکے ہیں۔ چنانچہ یہی ہمارے لیے بڑا چیلنج ہے۔ ہم نے چاہا تھا کہ انتخابی عمل سے ایک ایسی حیثیت اختیار کر لیں، جس میں ہم لوگوں تک اپنی بات پہنچا سکیں۔ لیکن محسوس ہوا کہ اسلامی قوتوں (اسلامی تحریکوں کا نہیں) کا تقسیم در تقسیم ہونا بلکہ متحارب ہونا، اس راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ بنا ہے۔ ہم ان تجربات اور تلخ حقائق سے سیکھ رہے ہیں۔ اسلامی تحریک کو یہ جمود توڑنے کے لیے مستقبل میں زیادہ Populist (مقبول عام) پالیسی اختیار کرنا پڑے گی، جس کے معنی عوام کو متحرک اور بیدار کرنا ہے۔ اس بھرپور کاوش سے یادور سٹرکچر کو تبدیل کرنے کا عمل تیز ہو گا۔ ممکن ہے کہ اس وجودِ حمد کے ابتدائی مرحلے میں عوامی سطح پر متوقع ابلاغ نہ ہو سکے، لیکن اگر ہدف واضح رہے اور تنظیم میں مضبوطی رہے تو پھر جمود مسلسل کے نتیجے میں ان شاء اللہ ضرور تبدیلی آئے گی۔

سوال: اسلامی تحریکوں نے خلیج میں جنگ ۱۹۹۱ء کے دوران جو نقطہ نظر اختیار کیا تھا کیا وہ اسی مقبول عام پالیسی اپنانے کے تقاضے کے تحت تھا؟

جواب: اس پالیسی کو آپ اسلامی تحریکات کے مجموعی ہدف سے مکمل طور پر علیحدہ نہیں کر سکتے۔ لیکن جس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ عراقی صدر صدام حسین کے معاملے میں مسلم عوام نے مجموعی طور پر جس رویے کا اظہار کیا ہے، اس کو عام طور پر دوستوں نے محض ایک پہلو سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ میری دیانت دارانہ رائے میں مسلم عوام کا رد عمل، صدام حسین سے کسی محبت یا اس سے کسی اچھی توقع کی بنیاد پر نہیں تھا، بلکہ وہ حجاز مقدس کے اس پاس امریکہ کی قیادت میں ہونے والی مداخلت، اس کے اثرات اور اس علاقے پر مغرب کے سیاسی اور ثقافتی غلبے پر اپنی نفرت کے برملا اظہار کے لیے تھا۔ بلاشبہ وقتی طور پر صدر صدام اس مزاحمت کا Symbol (علامت) بن گیا اور کچھ لوگوں نے سادہ لوحی میں اسے یہ معنی دیے کہ گویا یہ عوامی تحریک صدر صدام کی شخصی حمایت میں ہے۔ میں پھر اس نکتے پر زور دوں گا کہ وہ عوامی رد عمل صدام کی ذات کے لیے ہرگز ہرگز نہیں تھا۔

یہ چیز میرے اس نقطہ نظر کو تقویت پہنچاتی ہے کہ اپنی ساری خامیوں کے باوجود مسلمان

عوام کے ذہن کمزور سی، جذباتی اور Confused سی، لیکن وہ کھلے کھلے اسلام اور کھلے کھلے کفر میں فرق سے واقفیت رکھتے ہیں اور حکمران طبقوں سے زیادہ اسلام اور مسلم امت کے مفاد کی تڑپ رکھتے ہیں۔ یہ نسلی اور ان پڑھ مسلمان، کفر کے غلبے اور اسلام کے غلبے کو ایک دوسرے سے متضاد سمجھتے ہیں۔ یہ اسلام کے غلبے کے خواہش مند ہیں اور کفر کے غلبے سے نفرت کرتے ہیں۔ اس تناظر میں عوام کے جذبات کو سامنے رکھنا یا عوام کے جذبات اور اسلامی تحریکات کی سوچ میں مطابقت کا پیدا ہونا ایک فطری اور صحیح منظر ہے۔ اس بحران اور عوامی رد عمل کو اسی پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی سامنے رہے کہ صدام حسین اور اس جیسے لیڈروں کے بارے میں خود مغربی اور عرب دنیا کے حکمرانوں کا رویہ بھی بدلتا رہا ہے۔ اسلامی تحریکات عراق کی بعث لیڈرشپ کی اصولی مخالفت اس وقت سے کر رہی ہیں، جب عرب دنیا میں "بعث" قیادتیں ابھریں۔ لیکن وہ صدام حسین کو یا حافظ الاسد، مختلف عرب قیادتیں ان کو اپنا دوست بناتی رہیں اور مفاد کی اس جنگ میں ان کی دوستیاں اور دشمنیاں بدلتی رہیں۔ کئی انہی قیادتوں نے صدام کو مضبوط کیا اور آج حافظ الاسد کا سارا بھتی ہوئی ہیں۔ اسلامی تحریکات نے تو دونوں ہی کے ہاتھوں زخم کھائے ہیں اور ان میں سے کسی سے بھی ہم اچھی امید نہیں رکھتے۔ غلبے کی جنگ کے دوران میں اصل مسئلہ کسی شخصیت کا نہ تھا یہی وجہ ہے کہ اسلامی تحریکوں نے صاف، واضح اور غیر مبہم الفاظ میں کویت پر صدام کی جارحیت کی کھلی مذمت کی اور کویت کی آزادی اور بحالی کا مطالبہ کیا۔ البتہ ان کی اصل مخالفت امریکہ کے اس "نئے عالمی نظام" (New World Order) کے خلاف تھی، جس نے اس لڑائی کو ایک تہذیبی اور سیاسی جہت دے دی تھی۔

### ایران اور اسلامی انقلاب

سوال: دور حاضر میں اسلام کی تحریکوں کا ایک کامیاب انقلاب ایران میں امام خمینی کی قیادت میں برپا ہوا۔ خمینی صاحب کی حکمت عملی کے برعکس مولانا مودودی نے ماچھی گوٹھ کے اجتماع ۱۹۵۷ء میں جو پارلیمانی انتخابی پالیسی اختیار کی تھی وہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں کیا ناکام نہیں ہو گئی؟ جب کہ امام خمینی نے تو کم عرصے میں اپنا ہدف حاصل کر لیا؟

جواب: یہ موازنہ حقیقت پسندانہ نہیں ہے۔ بلاشبہ امام خمینی نے جو تحریک اختیار کی وہ زیادہ مقبول عام تھی اور اس تحریک میں عوام کا حصہ بہت زیادہ تھا۔ لیکن یہ امر واضح رہے کہ یہ ایسی کوشش نہیں تھی کہ جس میں آپ brick by brick (اینٹ در اینٹ) کوئی چیز تعمیر کریں، بلکہ اس کی حیثیت اس طوفان اور ریلے کی سی تھی، جو اگر صحیح وقت میں برپا ہو جائے تو تعمیر کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے اور اگر ذرا سی غلطی ہو جائے تو تخریب کے لیے بھی کردار ادا کر سکتا ہے اور خود اس کے علم برداروں پر پلٹ سکتا ہے۔ پہلوی بادشاہت اور امریکی اثرات کے تابع ایران کے حالات کے ساتھ ساتھ سب سے اہم بات یہ ذہن میں رکھیے کہ وہاں شیعہ مذہب ایک منظم قوت ہے، جس میں اطاعت اور رہنمائی کا مرکز "قم" تھا اور ہے۔ "قم" سے پروان چڑھنے والا یہ تنظیمی ڈھانچہ بڑا محمدا، مربوط اور حکومت کی گرفت سے آزاد اور خود مختار ہے۔ اس کے پاس صرف مذہبی قوت نہیں ہے بلکہ مالی قوت بھی ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ انقلاب کی ایک نفسیات ہوتی ہے۔ انقلابات کی نفسیات کا آپ مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ ظلم جتنا شدید ہوتا ہے، رد عمل بھی اتنا ہی شدید ہوتا ہے۔ "سائیکالوجی آف ریولوشن" کے اس پس منظر میں دیکھا جائے تو ایران کی صورت حال بڑی منفرد نوعیت کی تھی۔ وہاں تمدن، ظلم، آمریت، خفیہ سروس کا جتنا ہوش رہا نظام تھا اور جس وسیع پیمانے پر لوگوں کو گرفتار کر کے خاندانوں کے خاندانوں کو برباد کر دیا گیا تھا، اس کے خلاف نفرت اور گھٹن اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گئی تھی۔ امام خمینی نے ان حالات میں صحیح وقت پر اقدام کیا۔ ان کے پاس مشیزمی موجود تھی جس کے ذریعے وہ اسے صحیح وقت پر استعمال کر سکے۔

تیسری بات جس سے شاید کچھ لوگ متفق نہ ہوں، لیکن ہر حال میں اپنی دیا نندہ ارادہ رائے کا اظہار کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مختلف وجوہ کی بنا پر اپنے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ خود امریکہ بھی ایرانی بادشاہ رضا شاہ پہلوی سے اکٹھا سا گیا تھا۔ اس ضمن میں شاہ کی جانب سے تیل کے خود مختار استعمال نے بھی اپنا رنگ دکھایا، ساتھ ہی ساتھ ڈھائی ہزار سالہ جشن بادشاہت جہاں ایک طرف اس کا نقطہ عروج تھی تو دوسری طرف زوال کا نقطہ آغاز بھی ٹھہری۔

سوال: کیا روح اللہ خمینی تحریک سے ابتداء میں امریکی خوش تھے؟

جواب: اس ضمن میں امریکہ کا معاملہ عجیب و غریب رہا ہے۔ امریکہ نے پہلے تو شاہ ایران

کو ہر طرح سے مضبوط بنانے کی کوشش کی، تاکہ ایران اور اسرائیل دونوں مل کر اس علاقے میں امریکہ کے سیاسی، دفاعی اور معاشی مفادات کی تکمیل کر سکیں۔ اس خدمت کی انہام دہی کے عوض شاہ ایران نے اپنے اقتدار کو استحکام بخشنے کے لیے پوری پوری قیمت وصول کرنا شروع کی۔ کچھ ہی عرصے بعد شاہ ایران نے اپنی بحریہ، فضائیہ اور بری افواج کو وسعت دینے کے ساتھ ساتھ اسے اعلیٰ درجے کے اسلحے سے لیس کرنا شروع کیا، تاکہ علاقائی قوت کے طور پر اپنی آزادانہ مرضی سے پیش رفت کرے۔ اس ضمن میں شاہ ایران نے افغانستان، پاکستان، عراق وغیرہ سے بھی سلسلہ جنمائی شروع کیا۔ شاہ ایران کے رفتہ رفتہ ظاہر ہونے والے ان عزائم پر امریکہ کا ماتھا ٹھکا۔ تب ماضی کے برعکس اس نے ایران میں "بنیادی انسانی حقوق" کے مسئلے کو اٹھانا شروع کیا۔ شاہ ایران کے دورہ امریکہ کے موقع پر بھی یہ ایک پس پردہ محرک تھا۔ واضح رہے کہ امریکہ کی یہ حکمت عملی امام خمینی کو برسرِ اقتدار لانے کے لیے نہیں تھی، بلکہ محض شاہ پر دباؤ ڈالنے، دھمکانے، امریکی مرضی کے تابع رکھنے اور آخر کار ایرانی فوجی انقلاب کے لیے تھی۔ لیکن امام خمینی کی قیادت میں انقلاب کی تیز لہر نہ صرف شاہ کو ہالے گئی، بلکہ خود امریکی مفادات کو سارا دینے والا لنگر بھی ٹوٹ گیا۔ دوسرے لفظوں میں خمینی تحریک کی ابلاغی سطح پر تشہیر کے ذریعے شاہ کو دبانے اور امریکی پالیسی کا حصہ تھا، مگر خمینی کو لانا امریکی پالیسی میں نہیں تھا، بہر حال یہ ظاہر ہے کہ نتیجہ ان کے اندازوں کے برعکس ظاہر ہوا۔ شاہ کے خلاف تحریک کے دوران امام خمینی سے ملنے کے لیے میں خود فرانس گیا تھا۔ اس انقلاب کی پوری دنیا کی فضا بنانے کے لیے فرانس میں ذرائع ابلاغ نے جو کردار ادا کیا ہے، اسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

جو صورت حال انقلاب کے لیے وہاں پیدا ہوئی، اس کو پیدا کرنے میں یہ عوامل ماسخنہ رکھنے پڑیں گے۔ یہ ایک منفرد نوعیت کا معاملہ تھا۔ ان چیزوں کا عمل اور رد عمل جس طریقے سے ایران میں ۷۹ء-۱۹۷۸ء کے دوران ہوا ہے، وہ پاکستان میں موجود نہیں۔ اس لیے اس کا دوسروں سے موازنہ کر کے یہ کہنا کہ فلاں حکمت عملی کامیاب ہو گئی اور فلاں ناکام، نہ صرف جذباتی رویہ ہے بلکہ علمی اور عملی دونوں اعتبار سے صحیح نہیں ہے۔

جہاں تک جماعت اسلامی کی ماچھی گوشتہ میں طے کی جانے والی حکمت عملی کا تعلق ہے (یہ پالیسی مولانا مودودی کی تقریر "تحریک اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل" میں پوری وضاحت سے دیکھی جاسکتی ہے) اسی پر جماعت اسلامی ابھی تک عمل کر رہی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں وہ پالیسی ناکام ہو گئی ہو اور ۱۹۸۵ء کے بعد ہم نے کوئی نئی حکمت عملی بنالی ہو۔

حکمت عملی وہی ہے کہ ہمیں چار میدانوں میں کام کرنا ہے یعنی فکری اور نظریاتی دعوت، اخلاقی اصلاح اور تنظیم، معاشرہ کی اخلاقی بنیادوں پر تشکیل نو اور سیاسی نظام کی اصلاح اور نئی قیادت کو بروئے کار لانے کی جدوجہد۔ یہ پورا کام ایک دوسرے سے مربوط اور اس پر منحصر ہے۔ ہم جس حد تک اولین تین میدانوں یعنی فکری تعمیر و تشکیل، تنظیمی قوت کا حصول اور اسلامی معاشرے میں کامیابی حاصل کریں گے اسی قدر ہمیں سیاسی حیثیت سے اقدام کرنے اور آگے بڑھنے کے کام کرنے ہوں گے۔ ۱۹۷۰ء کی انتخابی ناکامی میں بڑی وجہ یہ تھیں کہ اسلامی قوتیں تقسیم تھیں، بلاشبہ انہیں مجموعی طور پر زیادہ ووٹ ملے، لیکن وہ مجتمع سیاسی قوت حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ۱۹۶۵ء سے لے کر ۱۹۷۰ء تک کا دور پاکستان کی سیاسی زندگی میں ایک بڑا نازک زمانہ ہے۔ اس عہد میں طوفان کی طرح کچھ عصیہ تئیں ابھریں، جن میں علاقائیت اور معاشی وجوہ سے طبقہ واریت اور سماجی نفرت شامل تھی۔ میری دیانت دارانہ رائے ہے کہ تحریک اسلامی نہ تو ان کا توڑ کر سکی اور نہ اس صورت حال کے پیش نظر پروگرام وضع کر سکی۔ اُن انتخابات میں ہم اپنی حکمت عملی اور برسر زمین موجود معروضی سیاسی و معاشی حقائق میں مطابقت پیدا نہیں کر سکے اور اس وجہ سے مطلوبہ نتائج رونما نہ ہو سکے۔

اس ضمن میں اور اک اور رد عمل یا قبولیت دونوں کی کمی رہی۔ میں اپنے آپ کو بھی اس میں برابر کا ذمہ دار سمجھتا ہوں، چاہے میں ملک میں اس وقت موجود نہیں تھا، لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ اس عہد میں یہ ایک خلا تھا، جسے ہم بروقت پر نہیں کر سکے۔

سوال: ایک یہ بات بھی ہے کہ ایران یک لسانی اور ایک غالب نسلی معاشرہ ہے۔ جبکہ پاکستان کثیر لسانی اور مخلوط قومی معاشرہ ہے۔ میرے تجزیے کے مطابق یہاں علامہ اقبال کی فکر اور مولانا مودودی کی زیر قیادت تحریک اسلامی کی اپیل پنجاب اور یو، پی سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں زیادہ مقبول ہوئی، جبکہ سرحد میں اس سے کم مقبول ہوئی اور پھر سندھ میں سندھی بولنے والوں میں تو اس سے بھی کم۔ اس طرح تحریک اسلامی کے حق میں قومی سطح پر جذبہ قبولیت نہیں ابھرا۔ کیا ایران کے مقابلے میں نسلی اور لسانی مضمرات بھی پاکستان کی تحریک اسلامی کی راہ میں بڑی رکاوٹ نہیں ہیں؟

جواب: ان چیزوں کے مضمرات تو بلاشبہ کارفرما ہیں، لیکن میں ان کو غالب اسباب نہیں



"دیسی پرستار" انہیں اس کے بالکل برعکس پیش کر رہے ہیں، جس کا عنوان انہوں نے "ترقی کا دشمن، گلیہ کا حقیر اور بنیاد پرست" یا "فنڈا میٹلزم" رکھا ہے۔ یہ ساری کی ساری چیزیں جو کہ مغرب کے تصور "بنیاد پرستی" کا اسیرہ ہیں وہ ان کو غلط طور پر اسلامی تحریکوں کے سر تعویذ رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس لفظ کا استعمال اسلامی تحریکوں کے لیے بالکل غلط اور بے جا ہے۔ ہمیں کوئی معذرت خواہی نہیں کرنی چاہیے۔ مجھ سے جب بھی مغربی دانشوروں یا ان کے حاشیہ نشینوں نے یہ سوال کیا تو میں نے ان سے یہ بات کہی کہ اگر فنڈا میٹلزم اس بات کا نام ہے کہ میں اسلام کو ہدایت کا سرچشمہ فیض تسلیم کروں اور آج کے دور میں وقت کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس جذبے اور روح کی بنیاد پر، کسی ذہنی تحفظ کے بغیر ایک نظام تشکیل دینے میں اپنا حقیر سا حصہ ادا کروں تو مجھے اس پر فخر ہو گا۔ اس عمل کے نتیجے میں آپ چاہے مجھے فنڈا میٹلٹ (بنیاد پرست) کہیں، چاہے اسلامٹ کہیں، چاہے قدامت پسند کہہ لیں یا اسی طرح کچھ اور کہیں، مجھے اس پر کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ لیکن یہاں معاملہ دوسرا ہو رہا ہے کہ ایک غلط تصور کو گھنٹاؤں کے انداز سے ایک گالی ناصحہ میں لپیٹ کر پیش کیا جا رہا ہے اور اسے ناروا طور پر اسلامی تحریکوں پر مسلط کیا جا رہا ہے۔ یہ عمل اس حکمت عملی کے طور پر کیا جا رہا ہے کہ پہلے ایک چیز کو برا نام دواور پھر شوق سے سولی پر چڑھا دو۔

ہم یہ چاہتے ہیں کہ اسلام کا پیغام ایمان و امن قبول ہو اور وہ سارے معاملات کی بنیاد بنے۔ جبکہ مغرب یہ چاہتا ہے کہ آپ اسلام کا نام نکل استعمال کرنا چاہتے ہیں تو کر لیں، مگر روح اور مواد سارا مغرب سے لیں۔ لیکن ہم کسی دائرے میں بھی مغرب کی اس جبری ہدایت (Dictation) کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتے۔ پھر مغرب یہ بھی چاہتا ہے کہ عالم اسلام میں اس کی پشت پناہ آمریتوں، نام نہاد جمہوریتوں اور بادشاہتوں کو ظلی الہی کے طور پر تسلیم کیا جائے، مگر ہم واضح طور پر کہتے ہیں کہ ہم اس کے لیے بھی کسی طور پر تیار نہیں۔ ہمارے اس موقف کے جواب میں مغرب نے صلیبی نفرت کو نیا لبادہ پہنا کر "بنیاد پرستی" کی گالی کی شکل دے دی ہے۔

مسلم سوسائٹی کا انحطاط اور اسلامی تحریک

سوال: قریب ترین تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اسلامی راسخ العقیدہ یا

مغرب کی اصطلاح میں "بنیاد پرست" لوگوں کی جتنی بھی تحریکیں ہیں، وہ ایک سطح تک اپنی تحریک کو کامیابی تک پہنچاتی ہیں، مگر اس کے بعد مسلم قوم پرست بلکہ صحیح معنوں میں سیکولر گروہ اس پر قابض اور حاوی ہو جاتے ہیں۔ بیسویں صدی کی جدید تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ کیا اسلامی تحریکیں ہمیشہ مغرب پسند مسلم قوم پرستوں کے لیے ایک ثانوی کردار ہی ادا کرتی رہیں گی؟

جواب: یہ ایک بنیادی سوال ہے۔ اس وقت مسلم سوسائٹی کی صورت حال یہ ہے کہ مختلف وجوہ سے مغربی اقوام کے ہاتھوں سیاسی شکست نے اس کو اس مقام پر پہنچا دیا ہے۔ میری نگاہ میں قوی زوال کا آغاز سیاسی شکست سے منسوب نہیں ہوا کرتا۔ شکست بلاشبہ ایک حد تک بری شے ہے، مگر زندگی کے مدوجز کا ایک لازمی حصہ بھی ہے۔ البتہ شکست کو تسلیم کر کے بیٹھ جانا موت کے مترادف ہے۔ اس لیے یہ ماننا چاہیے کہ شکست مسلم سوسائٹی کے گونا گوں تضادات کا ایک نتیجہ اور تسلسل ہے۔ اور اس کے نتیجے کے طور پر اسلامی تحریکات ایک بڑا ہی قابل قدر، تخلیقی اور ہمہ گیر شعور دینے کے باوجود ابھی تک مسلم سوسائٹی میں مکمل تبدیلی کا باعث نہیں بن سکیں۔ البتہ اس جدوجہد میں وہ پوری لگن کے ساتھ مصروف ہیں۔ میرے خیال میں اس صبر آزما اور وقت طلب عمل کا سبب یہ ہے کہ اسلامی تحریکات نے بڑے نامساعد حالات میں کام کا آغاز کیا۔ یہ وہ وقت تھا جب علمی، فکری، ذہنی اور اخلاقی طور پر مغربی تہذیب نے مسلمانوں پر ہمہ گیر تسلط حاصل کر لیا تھا۔ بگاڑیساں تک پہنچ گیا تھا کہ مصر جیسے مسلمان ملک میں برطانوی اقتدار کے خلاف جنگ آزادی کے دوران رمضان کے مہینے میں عوام کے سامنے سعد زغلول خراب پیتا ہے، مگر پھر بھی لوگ اس کو زندہ باد کے نعروں سے ہی نوازتے ہیں، اسی طرح نیاز فتح پوری کو تمام تر ملحدانہ نظریات کے باوجود مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور جامعہ ملیہ دلی میں ہیرو سمجھا جاتا ہے۔ انہی حالات کے بارے میں اقبال نے کہا:

تھا جو نا خوب بتدریج وہی خوب ہوا

کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اس پس منظر میں تحریک اسلامی نے دنیا بھر میں مختلف قیادتوں کے تحت مگر ایک واضح فکر کے ساتھ کام شروع کیا۔ ان کا کام دو پہلوؤں پر منحصر تھا: ایک فکری کہ انہیں باطل نظریات

لیکن منظم کوشش کے ذریعے لسانی (Ethnic) نسلی (Racial) صوبائی (Provincial) عصبیتوں کو حکومتی ایوانوں اور سرکاری اداروں ہی نے پروان چڑھایا اور مختلف عناصر نے جو غالب تعداد میں اشتراکی اور سیکولر فکر کے حامل تھے، انہوں نے بہت مقتدرہ کی اس ضمن میں باقاعدہ مدد کی۔ قائد اعظم کی واحد ذات اس کے سامنے سینہ سپر تھی مگر حصول پاکستان کے بعد ان کی آنکھیں بند کرتے ہی خود ان کے دست و بازو تماشائی بن گئے، یا ان کی انگلیوں کے خلاف چل لکے۔ میرے نزدیک یہ اسلام اور پاکستان سے بغاوت کی عملی کوشش تھی۔ ان عصبیتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی متبادل قوت پھیلنے پھولنے نہیں دی گئی اور "قرارداد مقاصد" کی منظوری بذات خود تحریک پاکستان کے تسلسل اور قیام پاکستان کے ثمرات کی دستاویزی تشکیل تھی۔

جہاں تک آپ نے علامہ اقبال کی بات کہی ہے میں بر بنائے علم یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اقبال کا اثر تقسیم سے پہلے تک سندھ میں، بہار میں، بنگال میں یا دکن میں اس سے کچھ کم نہیں تھا، جتنا کہ پنجاب میں تھا۔ علامہ محمد اقبال کا پیغام ایک قوت متحرکہ کے طور پر مسلمانوں کو اجارے میں اپنا کردار ادا کرتا رہا ہے اور کرے گا۔

سوال: کیا واقعی؟ خاص طور پر مسلم اکثریتی علاقوں، سرحد، سندھ اور بنگال کے حوالے سے؟

جواب: جی ہاں، یہ بات میں علامہ محمد اقبال کے حوالے سے کسی پرلہ میگزین کے زیر اثر یا خوش عقیدگی کی بناء پر نہیں بلکہ پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں۔ مثلاً سندھ کے بارے میں جی ایم سید صاحب کا وہ خطبہ اشاعہ کر پڑھ لیں جو ۱۹۴۳ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں موصوف نے پڑھا ہے اور جس میں آج کے اس سیکولر اور سدھی قوم پرست لیڈر نے اقبال کی فکر اور پیغام میں شامل تمام چیزوں کا حوالہ دیا ہے۔ "خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی" جیسے خوبصورت اشعار سے یہ خطبہ مزین ہے اور یہ کہ "ہم اگر بچ سکتے ہیں اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہیں تو صرف اس وقت جب کہ پورے برصغیر سے مسلمان یہاں آ کر ہماری معاشی ترقی میں ہاتھ بٹائیں اور ہمیں ہندوؤں کے تسلط سے نہات دلائیں۔"

سوال: جی ایم سید کے یہ اپنے خیالات تھے یا آل انڈیا مسلم لیگ کا کوئی فیڈ بیک تھا؟

جواب: بالکل نہیں، یہ نہ صرف جی ایم سید صاحب کے اپنے خیالات تھے، بلکہ یہ سندھ

کے مسلمانوں کے خیالات تھے اور یہ بات ۱۹۴۳ء کی ہے۔ اس دور کے بہت سے سندھی دانش ورروں نے بھی انہی خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے برعکس یہ سارے کا سارا رجعت قمری اور انقلاب مکھوس دراصل پاکستان بننے کے بعد ہوا اور اس میں ماجروہ نہابی سیاسی قیادت اور انہی پر مشتمل بیوروکریسی کی کھلی کھلی ناکامی ہے۔ اس بناء پر میں اب بھی اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ پاکستان کے مسلمانوں میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ ان کے سامنے اگر اسلام کو محض ایک نعرے کے طور پر نہیں، بلکہ اسلام کو ان کے سامنے زندگی کے ایک پروگرام کے طور پر پیش کیا جائے، جس میں انصاف، آزادی اور معاشی حقوق کا تحفظ مل سکے اور کوئی مخلص قیادت گروہی و ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر عوام کا اعتماد حاصل کر لے تو ان کو وہ مسلمانہ اور عادلانہ راہ عمل دی جا سکتی ہے، جس کے اندر یہ قومیتیں باوقار انداز سے اپنا برادرانہ کردار ادا کر سکتی ہیں اور پنپ بھی سکتی ہیں۔

میں نے جہاں تک قومیتوں کے بارے میں اسلام کا مطالعہ کیا ہے، اسلام نے قومیت کے وجود سے انکار نہیں کیا، بلکہ اسے ایک بالاتر وفاداری سے منسوب، مربوط اور متحرک کیا ہے۔ اس کی ایک کلاسیکل مثال یہ ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ نے اپنی فوج کو تربیت دیتے ہوئے ہر قبیلے کو ایک مقام دیا، اس قبیلے کے سردار کو جھنڈا دیا اور ارشاد فرمایا ”چونکہ تم اپنی روایات جانتے ہو، اس لیے انہی روایات کے مطابق تمہیں یہ مقام دیا ہے، مگر قبیلے کی عظمت کے لیے نہیں۔“ آپ ﷺ نے یہ عمل پیش کیا لیکن یہاں پر یہ نہیں کیا گیا، بلکہ یہاں پر ان حقوق کی بات کرنے والے کو اسلامی اور پاکستان کا دشمن سمجھ لیا گیا۔ ہمارے پاس تو اسلام میں علاقائی ترقی کی پوری تاریخ ہے، مگر پاکستان میں اس کو نہیں اپنایا۔ جب تک ہم قومیتوں کو اللہ اور اس کے رسول سے منسوب ایک بالاتر وفاداری کے دائرے میں نہیں لائیں گے تو ایسے بحران آتے رہیں گے۔

ہم سب اسی پہلو پر سوچ رہے ہیں اور یہ ایک مسلسل عمل ہے۔ نہ ہم پچھلے تسلسل اور عمل کو ترک کر رہے ہیں اور نہ غور و فکر کی راہ پر چل کر ماضی کی روایت ہی سے انحراف کر رہے ہیں۔

سوال: ہم دیکھتے کہ دینی اور اسلامی تحریکیں جو بالآخر مسلم قوم پرستوں کے غلبے میں تحلیل ہوئیں یا مقتدی بن کر رہ گئیں۔ کشمیر، فلسطین، افغانستان، پاکستان اور الجزائر وغیرہ میں یہی ہوتا

دکھانی دے رہا ہے۔ اس پر کیا سوچا گیا ہے؟

جواب: اس بات سے مجھے اتفاق ہے کہ یہ سانحہ بار بار ہوا ہے کہ عوام نے اسلام کے نام پر قربانیاں دیں، لیکن آزادی حاصل ہوئی تو پہلے دوسروں نے اچک لیا اور قربانی دینے والوں کی انگلیوں کے مطابق اجتماعی زندگی کی صورت گری نہ ہو سکی۔ تقریباً ہر ملک میں پچھلے پچاس ساٹھ برسوں کے دوران میں یہی ہوا ہے اور اس کی بڑی مثال آپ کو پاکستان کے علاوہ الجزائر میں مل چکی ہے۔ اگرچہ تقریباً آٹھائیس برس بعد صورت حال میں تبدیلی آئی ہے، لیکن قرآن و شواہد سے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں۔ یہ دیکھیے کہ اس وقت اسلامی تحریکات ان تمام مقامات پر یعنی الجزائر، سوڈان، یمن، مصر، ترکی، بنگلہ دیش، افغانستان، فلسطین، کشمیر یا پاکستان، ہر جگہ وہ اپنی عمومی مقبولیت کی بنیاد کو وسیع اور مضبوط کر رہی ہیں۔ وہ اتحادی حکمت عملی (الائنس سٹریٹیجی) بھی استعمال کر رہی ہیں، جس میں سارے دینی عناصر کو مجتمع کرنے کی کوشش اور جستجو ہے اور دوسری طرف اپنے پروگرام کو اس طرح وسیع کر رہی ہیں کہ ان میں ملک کے سبھی مخلص لوگوں کے لیے جگہ پیدا ہو سکے۔

میرا مشاہدہ ہے کہ بحیثیت مجموعی اسلامی تحریکیں عوام کے جذبات اور مسائل کا پہلے سے زیادہ بہتر اور اکاپیش کر رہی ہیں اور اس عمل سے ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ ان شاء اللہ مستقبل بہتر ہو گا۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہماری مخالف قوتیں پہلے سے کمزور زیادہ قوت کے ساتھ سرگرم عمل ہیں اور ان کی پشت پناہی کرنے والے بھی پہلے کی طرح صاف بستہ موجود ہیں۔ یہود و ہنود اور نصرانیت کا اتحاد تو سرحدوں سے بالاتر تھا ہی، مگر ان کے ساز میں آواز ملانے اور محض ذاتی ترقی کے خواب دیکھنے والے کچھ سادہ لوح اور مغرب زدہ مسلمان بھی شامل ہیں۔

سوال: بلاشبہ ان لوگوں کے پاس وسائل بھی زیادہ ہیں اور دینی

فکر و عمل کے خلاف رد عمل کے فوری اور موثر ذرائع بھی ہیں؟

جواب: جی ہاں! اور ہم اپنے مخالفین کی قوت کا غلط اندازہ نہیں لگا رہے اور اپنی صلاحیت کے بارے میں بھی کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہیں۔ ماضی کی نسبت آج ہماری سمت پہلے سے کمزور زیادہ واضح ہے۔ مگر بہت کچھ کرنا باقی ہے، یہ سیکھنے سکھانے اور منظم کرنے کا عمل ہے۔

جواب: یہ موازنہ حقیقت پسندانہ نہیں ہے۔ بلاشبہ امام خمینی نے جو تحریک اختیار کی وہ زیادہ مقبول عام تھی اور اس تحریک میں عوام کا حصہ بہت زیادہ تھا۔ لیکن یہ امر واضح رہے کہ یہ ایسی کوشش نہیں تھی کہ جس میں آپ brick by brick (اینٹ در اینٹ) کوئی چیز تعمیر کریں، بلکہ اس کی حیثیت اس طوفان اور ریلے کی سی تھی، جو اگر صحیح وقت میں برپا ہو جائے تو تعمیر کے لیے بھی استعمال ہو سکتا ہے اور اگر ذرا سی غلطی ہو جائے تو تخریب کے لیے بھی کردار ادا کر سکتا ہے اور خود اس کے علم برداروں پر پلٹ سکتا ہے۔ پہلوی بادشاہت اور امریکی اثرات کے تابع ایران کے حالات کے ساتھ ساتھ سب سے اہم بات یہ ذہن میں رکھیے کہ وہاں شیعہ مذہب ایک منظم قوت ہے، جس میں اطاعت اور رہنمائی کا مرکز "قم" تھا اور ہے۔ "قم" سے پروان چڑھنے والا یہ تنظیمی ڈھانچہ بڑا محمدا، مربوط اور حکومت کی گرفت سے آزاد اور خود مختار ہے۔ اس کے پاس صرف مذہبی قوت نہیں ہے بلکہ مالی قوت بھی ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ انقلاب کی ایک نفسیات ہوتی ہے۔ انقلابات کی نفسیات کا آپ مطالعہ کریں تو دیکھیں گے کہ ظلم جتنا شدید ہوتا ہے، رد عمل بھی اتنا ہی شدید ہوتا ہے۔ "سائیکالوجی آف ریولوشن" کے اس پس منظر میں دیکھا جائے تو ایران کی صورت حال بڑی منفرد نوعیت کی تھی۔ وہاں تمدن، ظلم، آمریت، خفیہ سروس کا جتنا ہوش رہا نظام تھا اور جس وسیع پیمانے پر لوگوں کو گرفتار کر کے خاندانوں کے خاندانوں کو برباد کر دیا گیا تھا، اس کے خلاف نفرت اور گھٹن اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گئی تھی۔ امام خمینی نے ان حالات میں صحیح وقت پر اقدام کیا۔ ان کے پاس مشیزمی موجود تھی جس کے ذریعے وہ اسے صحیح وقت پر استعمال کر سکے۔

تیسری بات جس سے شاید کچھ لوگ متفق نہ ہوں، لیکن ہر حال میں اپنی دیا نندارانہ رائے کا اظہار کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ مختلف وجوہ کی بنا پر اپنے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ خود امریکہ بھی ایرانی بادشاہ رضا شاہ پہلوی سے اکتا سا گیا تھا۔ اس ضمن میں شاہ کی جانب سے تیل کے خود مختار استعمال نے بھی اپنا رنگ دکھایا، ساتھ ہی ساتھ ڈھائی ہزار سالہ جشن بادشاہت جہاں ایک طرف اس کا نقطہ عروج تھی تو دوسری طرف زوال کا نقطہ آغاز بھی ٹھہری۔

سوال: کیا روح اللہ خمینی تحریک سے ابتداء میں امریکی خوش تھے؟

جواب: اس ضمن میں امریکہ کا معاملہ عجیب و غریب رہا ہے۔ امریکہ نے پہلے تو شاہ ایران

تحریکیں تو بہت چھوٹی سی چیز تھیں۔ لیکن جنہوں نے اس "اصولی اقدام" کا ساتھ دیا اور اسی دعوے کے ساتھ دیا کہ "وہ اصول کی حکمرانی لارہے ہیں"۔ انہوں نے اقوام عالم اور مغربی طاقتوں کی بے حسی کو کس حد تک احساس و شعور عطا کیا؟۔

آپ اقوام متحدہ کی کارروائی کو اگر سمجھنا چاہتے ہیں تو کچھ اعلان شدہ دستاویزات موجود ہیں، جن میں کہا گیا کہ "یہ جنگ اقوام متحدہ کے چارٹر کے تحت ہوئی ہے اور یہ اس کی امن کوششیں ہیں"۔ اور ریکارڈ پر یہ بھی موجود ہے کہ مسئلے کے حل میں جتنا عدم تعاون کا رویہ عراقی صدر صدام حسین کا تھا، اتنا ہی عدم تعاون کا رویہ امریکہ کا بھی تھا۔ امن کی کوششوں میں امریکہ کا رویہ کھلی اور چھپی منافقت پر مبنی تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ دانش ورانہ پلج کے ساتھ "امریکہ بہادر" کو عراق کو تھقیے میں اخلاقی بیرو کے طور پر پیش کرنا دنیا کے بے رحم سیاسی حقائق کی صحیح عکاسی نہیں ہے۔ یہ ایک "گیم آف پالیٹیکس" تھی، جس میں امریکہ خاص مقام حاصل کرنا چاہتا تھا اور دوسری طرف صدام حسین ایک خاص پوزیشن حاصل کرنا چاہتا تھا۔ دونوں نے زور لگایا صدام ناکام رہا اور امریکہ کامیاب ہوا، مگر اس کے باوجود یہ مسئلے کی صرف ایک جہت ہے۔

سوال: اور یہ جو عراق نے قبضہ کر لیا تھا کویت پر؟

جواب: میں اسی طرف آ رہا ہوں۔ جہاں تک اسلامی تحریکوں کے موقف کی اخلاقی بنیاد کا تعلق ہے، میں اس سے پوری طرح مطمئن ہوں۔ لیکن یہاں پر یہ ضرور سمجھوں گا کہ اس لیے کو تدریج اور پس منظر سے کاٹ کر دیکھنا حقائق کے خلاف ہو گا۔

۳ اگست ۱۹۹۰ء کو عراق کے کویت پر قبضے کی مذمت میں محترم قاضی حسین احمد صاحب نے بیان دیا، جو میں نے خود لندن میں جاری کیا۔ اسی طرح کا بیان اخوان المسلمون کے مرشد عام محترم حامد ابو نصر صاحب نے ۳ اگست ہی کو قاہرہ سے جاری کیا، ان دونوں بیانات میں عراق کے کویت پر حملے کی صاف صاف لفظوں میں مذمت کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ "عراق کو کویت سے اپنی فوجیں واپس نکال لے جانی چاہئیں، اسے کویت پر قبضے کا کوئی حق نہیں پہنچتا ہے۔ عراق کے اعتراضات اور شکایات ختم کرنے کے لیے یہ اقدام قطعی طور پر غلط ہے، سیاسی معاملات کو بات چیت سے حل کرنا چاہیے۔" — (۳ اگست ۱۹۹۰ء سے لے کر ۹ اگست تک ہمارا کوئی ایسا بیان نہیں پیش کیا جاسکتا، جس میں کسی سطح پر بھی عراق کی ہم نوائی کا پہلو لکھتا ہو یا اس

حکمت عملی وہی ہے کہ ہمیں چار میدانوں میں کام کرنا ہے یعنی فکری اور نظریاتی دعوت، اخلاقی اصلاح اور تنظیم، معاشرہ کی اخلاقی بنیادوں پر تشکیل نو اور سیاسی نظام کی اصلاح اور نئی قیادت کو بروئے کار لانے کی جدوجہد۔ یہ پورا کام ایک دوسرے سے مربوط اور اس پر منحصر ہے۔ ہم جس حد تک اولین تین میدانوں یعنی فکری تعمیر و تشکیل، تنظیمی قوت کا حصول اور اسلامی معاشرے میں کامیابی حاصل کریں گے اسی قدر ہمیں سیاسی حیثیت سے اقدام کرنے اور آگے بڑھنے کے کام کرنے ہوں گے۔ ۱۹۷۰ء کی انتخابی ناکامی میں بڑی وجہ یہ تھیں کہ اسلامی قوتیں تقسیم تھیں، بلاشبہ انہیں مجموعی طور پر زیادہ ووٹ ملے، لیکن وہ مجتمع سیاسی قوت حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ۱۹۶۵ء سے لے کر ۱۹۷۰ء تک کا دور پاکستان کی سیاسی زندگی میں ایک بڑا نازک زمانہ ہے۔ اس عہد میں طوفان کی طرح کچھ عرصے تک ایمریں، جن میں علاقائیت اور معاشی وجوہ سے طبقہ واریت اور سماجی نفرت شامل تھی۔ میری دیانت دارانہ رائے ہے کہ تحریک اسلامی نہ تو ان کا توڑ کر سکی اور نہ اس صورت حال کے پیش نظر پروگرام وضع کر سکی۔ اُن انتخابات میں ہم اپنی حکمت عملی اور برسر زمین موجود معروضی سیاسی و معاشی حقائق میں مطابقت پیدا نہیں کر سکے اور اس وجہ سے مطلوبہ نتائج رونما نہ ہو سکے۔

اس ضمن میں اور اک اور رد عمل یا قبولیت دونوں کی کمی رہی۔ میں اپنے آپ کو بھی اس میں برابر کا ذمہ دار سمجھتا ہوں، چاہے میں ملک میں اس وقت موجود نہیں تھا، لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ اس عہد میں یہ ایک خلا تھا، جسے ہم بروقت پر نہیں کر سکے۔

سوال: ایک یہ بات بھی ہے کہ ایران یک لسانی اور ایک غالب نسلی معاشرہ ہے۔ جبکہ پاکستان کثیر لسانی اور مخلوط قومی معاشرہ ہے۔ میرے تجزیے کے مطابق یہاں علامہ اقبال کی فکر اور مولانا مودودی کی زیر قیادت تحریک اسلامی کی اپیل پنجاب اور یو، پی سے تعلق رکھنے والے لوگوں میں زیادہ مقبول ہوئی، جبکہ سرحد میں اس سے کم مقبول ہوئی اور پھر سندھ میں سندھی بولنے والوں میں تو اس سے بھی کم۔ اس طرح تحریک اسلامی کے حق میں قومی سطح پر جذبہ قبولیت نہیں ابھرا۔ کیا ایران کے مقابلے میں نسلی اور لسانی مضمرات بھی پاکستان کی تحریک اسلامی کی راہ میں بڑی رکاوٹ نہیں ہیں؟

جواب: ان چیزوں کے مضمرات تو بلاشبہ کارفرما ہیں، لیکن میں ان کو غالب اسباب نہیں



سمجھتا۔ یہ بات نہیں ہے پاکستان میں اردو بولنے والے اور پنجابی بولنے والے تو اسلام کا نفاذ چاہتے ہیں مگر بنگالی، سندھی، بلوچی، برہوی اور پشتو بولنے والے نہیں چاہتے۔ ایک خاص سطح تک ان تمام لسانی گروہوں میں کم و بیش ایک جیسا ہی اسلام کا تعلق ہے اور وہ عرب و عجم کی دیگر مسلمانوں قوموں سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہے۔ جہاں تک اس مفروضے کا تعلق ہے کہ ایران میں اس لیے انقلاب آگیا کہ وہ ایک لسانی ملک ہے تو میرے خیال میں اس انقلاب کے احوال و ظروف میں اس کو بڑا سبب قرار دینا درست نہیں۔ ایران میں بھی آپ کو ایرانی نسل کے افراد ملیں گے، عرب بھی ملیں گے اور گرد اور بلوچ بھی ملیں گے۔ آپ کو شیعہ آبادی کے ساتھ ساتھ قابل لحاظ تعداد میں سنی العقیدہ بھی ملیں گے۔

سوال: غالباً پچاس فیصد ایرانی تو شیعہ ہیں؟

جواب: ہماری معلومات کے مطابق وہاں ۳۰ فیصد سے زیادہ سنی ہیں اور ۷۰ فیصد یا اس سے کچھ کم شیعہ ہیں۔ ایسا نہیں کہ وہاں مکمل فقہی ہم آہنگی ہے۔ جس فضا کا تذکرہ میں نے اوپر کیا ہے ایسی فضا میں آئینہ بالوچی کو تنظیمی ڈھانچہ مل جائے اور عوامی قوت کو متحرک کر لیا جائے تو متحارب اور متضاد عوامل ایک ٹھم میں آجاتے ہیں۔ تحریک پاکستان اس کی نمایاں ترین مثال ہے جس میں سب لسانی اور نسلی گروہ تمام مذہبی مسلکوں کے پیروکار شریک ہوئے اور انہوں نے ایک اجتماعی نصب العین حاصل کر لیا۔

ہمارا اصل المیہ یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد تحریک پاکستان اور اس کے نتاج کو نظر انداز کر دیا گیا اور بد قسمتی سے ملک آزادی کے فوراً ہی بعد قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت سے محروم ہو گیا۔ قیام پاکستان کے کچھ ہی عرصے بعد یہاں کے استقامی، سیاسی اور ابلاغی ڈھانچے میں اسلام کو بنیادی نظریے کے طور پر قبضل کرنے سے گریز کی تحریک لائی گئی جو برابر بڑھتی گئی اور اس طرح ملک نئے قتل میں مبتلا ہو گیا۔

تحریک پاکستان اور پاکستان کا نظریاتی بحران

سوال: قیام پاکستان کے بعد "قرارداد مقاصد" بھی تو منظور ہوئی

تھی؟

جواب: میرا زور عملی پالیسی پر ہے۔ آپ دیکھیں تو پہلا ہدف اسلام اور پاکستانی قومیت تھا

لیکن منظم کوشش کے ذریعے لسانی (Ethnic) نسلی (Racial) صوبائی (Provincial) عصبیتوں کو حکومتی ایوانوں اور سرکاری اداروں ہی نے پروان چڑھایا اور مختلف عناصر نے جو غالب تعداد میں اشتراکی اور سیکولر فکر کے حامل تھے، انہوں نے بہت مقتدرہ کی اس ضمن میں باقاعدہ مدد کی۔ قائد اعظم کی واحد ذات اس کے سامنے سینہ سپر تھی مگر حصول پاکستان کے بعد ان کی آنکھیں بند کرتے ہی خود ان کے دست و بازو تماشائی بن گئے، یا ان کی انگلیوں کے خلاف چل لکے۔ میرے نزدیک یہ اسلام اور پاکستان سے بغاوت کی عملی کوشش تھی۔ ان عصبیتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے کوئی متبادل قوت پہلے نہ تھی اور "قرارداد مقاصد" کی منظوری بذات خود تحریک پاکستان کے تسلسل اور قیام پاکستان کے ثمرات کی دستاویزی تشکیل تھی۔

جہاں تک آپ نے علامہ اقبال کی بات کہی ہے میں بر بنائے علم یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اقبال کا اثر تقسیم سے پہلے تک سندھ میں، بہار میں، بنگال میں یا دکن میں اس سے کچھ کم نہیں تھا، جتنا کہ پنجاب میں تھا۔ علامہ محمد اقبال کا پیغام ایک قوت متحرکہ کے طور پر مسلمانوں کو اجارے میں اپنا کردار ادا کرتا رہا ہے اور کرے گا۔

سوال: کیا واقعی؟ خاص طور پر مسلم اکثریتی علاقوں، سرحد، سندھ اور بنگال کے حوالے سے؟

جواب: جی ہاں، یہ بات میں علامہ محمد اقبال کے حوالے سے کسی پرلہ گندھے کے زیر اثر یا خوش عقیدگی کی بناء پر نہیں بلکہ پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں۔ مثلاً سندھ کے بارے میں جی ایم سید صاحب کا وہ خطبہ اشاعہ کر پڑھ لیں جو ۱۹۴۳ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں موصوف نے پڑھا ہے اور جس میں آج کے اس سیکولر اور سدھی قوم پرست لیڈر نے اقبال کی فکر اور پیغام میں شامل تمام چیزوں کا حوالہ دیا ہے۔ "خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی" جیسے خوبصورت اشعار سے یہ خطبہ مزین ہے اور یہ کہ "ہم اگر بچ سکتے ہیں اور اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے ہیں تو صرف اس وقت جب کہ پورے برصغیر سے مسلمان یہاں آ کر ہماری معاشی ترقی میں ہاتھ بٹائیں اور ہمیں ہندوؤں کے تسلط سے نہات دلائیں۔"

سوال: جی ایم سید کے یہ اپنے خیالات تھے یا آل انڈیا مسلم لیگ کا کوئی فیڈ بیک تھا؟

جواب: بالکل نہیں، یہ نہ صرف جی ایم سید صاحب کے اپنے خیالات تھے، بلکہ یہ سندھ

کے مسلمانوں کے خیالات تھے اور یہ بات ۱۹۴۳ء کی ہے۔ اس دور کے بہت سے سندھی دانش ورروں نے بھی انہی خیالات کا اظہار کیا۔ اس کے برعکس یہ سارے کا سارا رجعت قمری اور انقلاب مکھوس دراصل پاکستان بننے کے بعد ہوا اور اس میں ماجروہ نہابی سیاسی قیادت اور انہی پر مشتمل بیوروکریسی کی کھلی کھلی ناکامی ہے۔ اس بناء پر میں اب بھی اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ پاکستان کے مسلمانوں میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ ان کے سامنے اگر اسلام کو محض ایک نعرے کے طور پر نہیں، بلکہ اسلام کو ان کے سامنے زندگی کے ایک پروگرام کے طور پر پیش کیا جائے، جس میں انصاف، آزادی اور معاشی حقوق کا تحفظ مل سکے اور کوئی مخلص قیادت گروہی و ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر عوام کا اعتماد حاصل کر لے تو ان کو وہ مسقط نہ اور عادلانہ راہ عمل دی جا سکتی ہے، جس کے اندر یہ قومیتیں باوقار انداز سے اپنا برادرانہ کردار ادا کر سکتی ہیں اور پنپ بھی سکتی ہیں۔

میں نے جہاں تک قومیتوں کے بارے میں اسلام کا مطالعہ کیا ہے، اسلام نے قومیت کے وجود سے انکار نہیں کیا، بلکہ اسے ایک بالاتر وفاداری سے منسوب، مربوط اور متحرک کیا ہے۔ اس کی ایک کلاسیکل مثال یہ ہے کہ جب حضور اکرم ﷺ نے اپنی فوج کو تربیت دیتے ہوئے ہر قبیلے کو ایک مقام دیا، اس قبیلے کے سردار کو جھنڈا دیا اور ارشاد فرمایا ”چونکہ تم اپنی روایات جانتے ہو، اس لیے انہی روایات کے مطابق تمہیں یہ مقام دیا ہے، مگر قبیلے کی عظمت کے لیے نہیں۔“ آپ ﷺ نے یہ عمل پیش کیا لیکن یہاں پر یہ نہیں کیا گیا، بلکہ یہاں پر ان حقوق کی بات کرنے والے کو اسلامی اور پاکستان کا دشمن سمجھ لیا گیا۔ ہمارے پاس تو اسلام میں علاقائی ترقی کی پوری تاریخ ہے، مگر پاکستان میں اس کو نہیں اپنایا۔ جب تک ہم قومیتوں کو اللہ اور اس کے رسول سے منسوب ایک بالاتر وفاداری کے دائرے میں نہیں لائیں گے تو ایسے بحران آتے رہیں گے۔

ہم سب اسی پہلو پر سوچ رہے ہیں اور یہ ایک مسلسل عمل ہے۔ نہ ہم پچھلے تسلسل اور عمل کو ترک کر رہے ہیں اور نہ غور و فکر کی راہ پر چل کر ماضی کی روایت ہی سے انحراف کر رہے ہیں۔

سوال: ہم دیکھتے کہ دینی اور اسلامی تحریکیں جو بالآخر مسلم قوم پرستوں کے غلبے میں تحلیل ہوئیں یا مقتدی بن کر رہ گئیں۔ کشمیر، فلسطین، افغانستان، پاکستان اور الجزائر وغیرہ میں یہی ہوتا

دکھانی دے رہا ہے۔ اس پر کیا سوچا گیا ہے؟

جواب: اس بات سے مجھے اتفاق ہے کہ یہ سانحہ بار بار ہوا ہے کہ عوام نے اسلام کے نام پر قربانیاں دیں، لیکن آزادی حاصل ہوئی تو پہلے دوسروں نے اچک لیا اور قربانی دینے والوں کی انگلیوں کے مطابق اجتماعی زندگی کی صورت گری نہ ہو سکی۔ تقریباً ہر ملک میں پچھلے پچاس ساٹھ برسوں کے دوران میں یہی ہوا ہے اور اس کی بڑی مثال آپ کو پاکستان کے علاوہ الجزائر میں مل چکی ہے۔ اگرچہ تقریباً آٹھائیس برس بعد صورت حال میں تبدیلی آئی ہے، لیکن قرآن و شواہد سے میں کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں۔ یہ دیکھیے کہ اس وقت اسلامی تحریکات ان تمام مقامات پر یعنی الجزائر، سوڈان، یمن، مصر، ترکی، بنگلہ دیش، افغانستان، فلسطین، کشمیر یا پاکستان، ہر جگہ وہ اپنی عمومی مقبولیت کی بنیاد کو وسیع اور مضبوط کر رہی ہیں۔ وہ اتحادی حکمت عملی (الائنس سٹریٹیجی) بھی استعمال کر رہی ہیں، جس میں سارے دینی عناصر کو مجتمع کرنے کی کوشش اور جستجو ہے اور دوسری طرف اپنے پروگرام کو اس طرح وسیع کر رہی ہیں کہ ان میں ملک کے سبھی مخلص لوگوں کے لیے جگہ پیدا ہو سکے۔

میرا مشاہدہ ہے کہ بحیثیت مجموعی اسلامی تحریکیں عوام کے جذبات اور مسائل کا پہلے سے زیادہ بہتر اور اکاپیش کر رہی ہیں اور اس عمل سے ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ ان شاء اللہ مستقبل بہتر ہو گا۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہماری مخالف قوتیں پہلے سے کم ہیں زیادہ قوت کے ساتھ سرگرم عمل ہیں اور ان کی پشت پناہی کرنے والے بھی پہلے کی طرح صاف بستہ موجود ہیں۔ یہود و ہنود اور نصرانیت کا اتحاد تو سرحدوں سے بالاتر تھا ہی، مگر ان کے ساز میں آواز ملانے اور محض ذاتی ترقی کے خواب دیکھنے والے کچھ سادہ لوح اور مغرب زدہ مسلمان بھی شامل ہیں۔

سوال: بلاشبہ ان لوگوں کے پاس وسائل بھی زیادہ ہیں اور دینی فکر و عمل کے خلاف رد عمل کے فوری اور موثر ذرائع بھی ہیں؟

جواب: جی ہاں! اور ہم اپنے مخالفین کی قوت کا غلط اندازہ نہیں لگا رہے اور اپنی صلاحیت کے بارے میں بھی کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہیں۔ ماضی کی نسبت آج ہماری سمت پہلے سے کم ہیں زیادہ واضح ہے۔ مگر بہت کچھ کرنا باقی ہے، یہ سیکھنے سکھانے اور منظم کرنے کا عمل ہے۔

سوال: یہ سعودی عرب کے دفاع اور کویت سے عراق کے انخلاء کا بھی تو مسئلہ تھا؟

جواب: یہیں پر تو آپ معاملے کو Confuse (گڈمڈ) کر رہے ہیں۔ اگست میں اصل مسئلہ کویت کے خالی کرانے کا نہیں تھا، اصل مسئلہ یہ تھا کہ سعودی عرب صدام کی متوقع دست برد سے محفوظ ہو۔ عرب لیگ کی قرارداد، یو این او کے ریزولوشن، صدر بش اور شاہ فہد صاحب کے بیانات پڑھ لیجئے، ان کے مطابق ہمیں بھی کویت کو خالی کرانے کے لیے امریکی افواج سعودی عرب میں نہیں آئی تھیں۔

سوال: عرب لیگ کی قرارداد تو آئی تھی کہ کویت کو عراق خالی کر دے؟

جواب: یہ مبنی برحق مطالبہ اپنی جگہ پر تھا۔ یہ مطالبہ ہم نے بھی کیا اور دوسرے لوگوں نے بھی، لیکن دیکھیں امریکی فوجیں کیوں بلائی گئیں؟ یہ فوجیں دراصل بلائی گئیں تھیں، صرف سعودی عرب کے دفاع کے لیے۔

سوال: چونکہ صدام حسین نے کویت کو عراق میں ضم کر لیا اس لیے سعودی حکومت یہی سمجھتی تھی کہ ہمیں اب کوئی عراق سے بچا نہیں سکتا اور نہ کویت کو آزاد کرا سکتا ہے، لہذا امریکہ کو دعوت دے دی گئی یا امریکہ نے زبردستی دعوت حاصل کر لی؟

جواب: اس میں تو کوئی اختلاف رائے نہیں ہے کہ کویت پر عراقی قبضہ نہایت غلط اور فاسقانہ اقدام تھا اور اس پر ساری قراردادیں یہ تھیں کہ عراق کویت کو خالی کرے۔ لیکن نومبر میں مسئلے نے یہ رخ اختیار کیا کہ "کویت کو خالی کرانے کے لیے قوت کا استعمال کیا جائے گا"۔ جب کہ امریکی فوج تو سعودی عرب کے دفاع کے لیے بلائی گئی تھی۔ اس ضمن میں، میں امریکی صدر بش کے الفاظ آپ کو سنا تا ہوں:

I have drawn a line on the sand and that is between the borders of Kuwait and Saudi Arabia.

تو بنیادی چیز یہ ہے کہ امریکی اتحادی فوج دفاع کے لیے تھی، انخلاء کے لیے نہیں تھی۔ یہ تبدیلی دوماہ کے بعد نومبر میں آئی۔ پھر یہ کہا کہ "دیگر ذرائع استعمال کیے جائیں" آخر میں کہا

تحریکیں تو بہت چھوٹی سی چیز تھیں۔ لیکن جنہوں نے اس "اصولی اقدام" کا ساتھ دیا اور اسی دعوے کے ساتھ دیا کہ "وہ اصول کی حکمرانی لارہے ہیں"۔ انہوں نے اقوام عالم اور مغربی طاقتوں کی بے حسی کو کس حد تک احساس و شعور عطا کیا؟۔

آپ اقوام متحدہ کی کارروائی کو اگر سمجھنا چاہتے ہیں تو کچھ اعلان شدہ دستاویزات موجود ہیں، جن میں کہا گیا کہ "یہ جنگ اقوام متحدہ کے چارٹر کے تحت ہوئی ہے اور یہ اس کی امن کوششیں ہیں"۔ اور ریکارڈ پر یہ بھی موجود ہے کہ مسئلے کے حل میں جتنا عدم تعاون کا رویہ عراقی صدر صدام حسین کا تھا، اتنا ہی عدم تعاون کا رویہ امریکہ کا بھی تھا۔ امن کی کوششوں میں امریکہ کا رویہ کھلی اور چھپی منافقت پر مبنی تھا۔

میں سمجھتا ہوں کہ دانش ورانہ پلج کے ساتھ "امریکہ بہادر" کو عراق کو تھقیے میں اخلاقی بیرو کے طور پر پیش کرنا دنیا کے بے رحم سیاسی حقائق کی صحیح عکاسی نہیں ہے۔ یہ ایک "گیم آف پالیٹیکس" تھی، جس میں امریکہ خاص مقام حاصل کرنا چاہتا تھا اور دوسری طرف صدام حسین ایک خاص پوزیشن حاصل کرنا چاہتا تھا۔ دونوں نے زور لگایا صدام ناکام رہا اور امریکہ کامیاب ہوا، مگر اس کے باوجود یہ مسئلے کی صرف ایک جہت ہے۔

سوال: اور یہ جو عراق نے قبضہ کر لیا تھا کویت پر؟

جواب: میں اسی طرف آ رہا ہوں۔ جہاں تک اسلامی تحریکوں کے موقف کی اخلاقی بنیاد کا تعلق ہے، میں اس سے پوری طرح مطمئن ہوں۔ لیکن یہاں پر یہ ضرور سمجھوں گا کہ اس لیے کو تدریج اور پس منظر سے کاٹ کر دیکھنا حقائق کے خلاف ہو گا۔

۳ اگست ۱۹۹۰ء کو عراق کے کویت پر قبضے کی مذمت میں محترم قاضی حسین احمد صاحب نے بیان دیا، جو میں نے خود لندن میں جاری کیا۔ اسی طرح کا بیان اخوان المسلمون کے مرشد عام محترم حامد ابو نصر صاحب نے ۳ اگست ہی کو قاہرہ سے جاری کیا، ان دونوں بیانات میں عراق کے کویت پر حملے کی صاف صاف لفظوں میں مذمت کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ "عراق کو کویت سے اپنی فوجیں واپس نکال لے جانی چاہئیں، اسے کویت پر قبضے کا کوئی حق نہیں پہنچتا ہے۔ عراق کے اعتراضات اور شکایات ختم کرنے کے لیے یہ اقدام قطعی طور پر غلط ہے، سیاسی معاملات کو بات چیت سے حل کرنا چاہیے۔" — (۳ اگست ۱۹۹۰ء سے لے کر ۹ اگست تک ہمارا کوئی ایسا بیان نہیں پیش کیا جاسکتا، جس میں کسی سطح پر بھی عراق کی ہم نوائی کا پہلو لکھتا ہو یا اس

کی جارحیت کو نظر انداز کیا گیا ہو۔

لیکن ۹ اگست کو جبکہ امریکہ نے اپنی فوجیں سعودی عرب میں اتارنا شروع کر دیں تو اس سے اگلے ہی دن ہم نے یہ بیان دیا کہ "عراق کا حملہ بہت بڑی حماقت تھا، لیکن امریکہ کی فوجوں کی آمد پورے علاقے کی سیاست کو بنیادی طور پر تبدیل کرتی ہے اور ان کو بلانا بھی بڑا غلط اقدام ہے۔ امریکی فوجوں کا آنا قطعی طور پر ناقابل قبول ہے اور ہم نے ان کی واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں۔" لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ "عراق کو کویت سے اور امریکہ کو سعودی عرب سے بیک وقت اپنی فوجیں بلا لینی چاہئیں اور مسئلے کا اسلامی دنیا (OIC) کی سطح پر یا عربوں کی سطح پر حل نکالنا چاہیے، ضرورت ہو تو مسلمانوں کی امن فوج تشکیل دی جائے۔ اور مسلمانوں کی امن فوج ہی کو ان کے درمیان حائل ہونا چاہیے، امریکہ اور یورپ کی فوج کو نہیں۔" یہ بات ہم نے ۹ اگست سے پندرہ جنوری ۱۹۹۱ء تک مختلف انداز میں اور تسلسل کے ساتھ کہی۔

۱۶ جنوری ۱۹۹۱ء کو جب امریکی اتحادی فوجوں کا عراق پر حملہ ہو گیا، تو ہم نے کہا "اب صورت حال یہ ہے کہ اگر ایک مریض بخار میں مبتلا ہو اور اس کی ٹس پھٹ جائے تو پھر وقتی طور پر بخار کو نظر انداز کر کے اس خون کو روکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہم نے اس وقت بھی عراق کے ہارحانہ اقدام کی تائید نہیں کی اور بعد میں بھی نہیں کی۔ لیکن چونکہ اس وقت فوری چیز جنگ کو روکنا تھا، اس لیے اسلامی تحریکوں کے موقف کا یہ اہم ترین پہلو تھا۔ اب اس میں کسی لیڈر کے بیان و اظہار کا لمبہ غیر ہموار رہا ہو وہ الگ چیز ہے۔ لیکن ہمارا موقف سب سے زیادہ منصفانہ تھا اور ہم نے اس فریم ورک کو نظر انداز نہیں کیا۔

سوال: عراقی حملہ ۲ اگست کو ہوا۔ اس وقت قاہرہ میں اسلامی وزراء خارجہ کی کانفرنس ہو رہی تھی۔ جب یہ خبر آئی کہ کویت پر قبضہ ہو گیا ہے، تو عرب وزرائے خارجہ نے کہا کہ اس کے لیے ہم ایک الگ اجلاس کرتے ہیں جس میں ایک متفقہ موقف لائیں گے۔ چنانچہ اسلامی وزراء خارجہ کی کانفرنس نے اس تجویز کو تسلیم کر لیا۔ لہذا ان کی ایک علیحدہ نشست اگلے دن تک ہوئی رہی۔ ۳ تاریخ کو جب واپس آئے تو ۲۱ ملک ۱۲ اور ۹ میں تقسیم ہو گئے۔ جن میں بارہ ممالک عراق کی مخالفت کر رہے تھے اور نو میں کچھ تائید کر رہے تھے۔ اس طرح عرب اور اسلامی ممالک کی جانب سے حل کے



امکانات ختم ہو گئے۔ اس کے بعد قومی سعودی ریاست کے طور پر اس کا استحقاق یہ تھا کہ وہ باہر سے فوجی مدد لے، کسی سے اتحاد کرے اور کسی بھی قوم، یا مذہب سے اپنے اتحادیوں کو پکارے۔ ۱۹۷۰ء میں جب پاکستان ٹوٹ رہا تھا تو ہم اہل پاکستان بھی تو امریکہ کے ساتویں بحری بیڑے کا انتظار کر رہے تھے کہ وہ ہمیں آ کر بچائے؟

جواب: عرب دنیا کے حوالے سے یہ استدلال صاف ہی خوش فہمی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔

سوال: دسمبر ۱۹۷۰ء میں یہ بات پاکستانی حکومت کی طرف سے سامنے آئی تھی، جس میں یہ تاثر تھا کہ "امریکی Rescue کے لیے آئیں گے۔"

جواب: صدر پاکستان جنرل یحییٰ خان کی طرف سے یہ دعوے اور بیوقوفی کی بات تھی۔ اس بات کا کوئی موازنہ ۱۹۹۰ء میں امریکی اتحادیوں کی طے کے صحرائوں، پانیوں اور لٹاؤں میں یلغار سے نہیں کیا جاسکتا۔

سوال: میں اب اسلامی تحریکوں کی بات نہیں کر رہا۔ جب سعودی عرب حکومت نے ۳ اگست کو یہ دیکھا کہ اب عرب اور مسلم برادری کے ہاتھوں اس کا حل نہیں نکل رہا تو پھر انہوں نے دو طرفہ معاہدوں کے تحت فوج منگوا لی اور اس طرح اپنا تحفظ کر لیا اور اس کے نتیجے میں کویت نے آزادی حاصل کی۔ اب ان حالات میں بلاشبہ اسلامی تحریکیں سفارتی سطح پر کوئی بنیادی کردار تو ادا نہیں کر سکتی تھیں، لیکن وہ سعودی اور امریکی اتحادیوں کی جنگی کارروائیوں کی مسلسل شدید ترین الفاظ میں مذمت کر رہی تھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ جنگ سے زیادہ ایک اخلاقی مسئلہ تھا جسے امریکہ نے اپنے حق میں استعمال کیا۔ جنگ کے دوران اسلامی تحریکوں کا عراق کے لیے جو موقف تھا، میں سمجھتا ہوں وہ عام طور پر غلط اور اسلامی نقطہ نظر سے بھی غیر معیاری تھا۔



جواب: یہ اعتراض صرف ایک خاص زاویے کی حد تک محدود ہے، مسئلے کی پوری تصویر کے بارے میں نہیں۔ جبکہ معروضی حالات، زمینی حقائق اور تاریخی تناظر میں ان واقعات کے مختلف مضمرات ہو سکتے ہیں۔

سوال: میرے خیال میں اگر ہم اس کو خالص اسلامی تناظر میں رکھ کر دیکھیں تو؟

جواب: نہ صرف اسلامی تناظر میں، بلکہ اس کو واقعاتی تناظر میں بھی دیکھئے تو ایک سے زیادہ پہلو اور مضمرات سامنے آتے ہیں۔ بلاشبہ عرب وزراء تقسیم تھے اور یہ از خود اس بات کو ثابت کرتا ہے کہ یہ صورت حال علاقائی سطح پر عربوں کے مفاد میں نہیں تھی۔ اگر اختلاف رائے چالیس پچاس چیزوں کے اندر ہو تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ اب کوئی اور حل باقی نہیں ہے یا کوئی اور راستہ نہیں نکل سکتا۔

سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ کیا بالی الحقیقت صدام کو ت پر حملے کے بعد سعودی عرب پر حملہ کر رہا تھا یا نہیں؟ یہ ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ ایک خیال یہ تھا کہ وہ حملہ نہیں کر رہا تھا۔ دوسرا موقف یہ تھا کہ وہ سعودی عرب پر حملہ کر رہا تھا اور سعودی عرب کو اپنے دفاع کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا چاہیے تھا۔ گو یہ چیز ثابت نہیں ہوئی اور امریکی صدر ہارجش نے بھی اپنی فوجیں بھیج دینے کے بعد یہی بات قوت کے ساتھ کہی کہ ”ہم فوجیں اس لیے بھیج رہے ہیں کہ سعودی عرب کا دفاع کریں۔“ گویا کوست سے عراقی فوجوں کو نکالنا پہلا مقصد نہیں تھا۔ امریکہ نے یہ مقصد ظاہر کیا ہے نومبر کے مہینے میں۔ پورا اگست، ستمبر اور اکتوبر یہی موقف اختیار کیا گیا کہ ”سعودی عرب سے ہمارا معاہدہ ہے۔“ ان ریکارڈز ہے کہ بقول انڈر سیکرٹری آف سٹیٹ شیفر، ”کوست سے چونکہ ہمارا معاہدہ نہیں تھا، اس لیے ہم کوست کے لیے فوج نہیں بھیج سکے اور چونکہ سعودی عرب سے ہمارا معاہدہ ہے اس لیے ہم فوج بھیج رہے ہیں۔“

سعودی عرب کے لیے دوسرا راستہ یہ تھا کہ عرب لڑ رہے ہوں یا نہ لڑ رہے ہوں، وہ اپنے پانچ سات یا دس ہندو دوست ممالک سے بات کرے اور ان سے مدد لے۔ میرا پنا قیاس ہے کہ صدام کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ سعودی عرب پر حملہ کرتا، لیکن میں اس امکان کو بالکل مسترد بھی نہیں کرتا۔ اگرچہ غالب ترین بات یہ ہے کہ وہ حملہ نہیں کر رہا تھا۔ سعودی عرب کے شاہ فہد صاحب کو سب سے پہلے یہ قدم اٹھانا چاہیے تھا کہ وہ صدام سے ملتے اور کوئی راستہ نکالتے۔ شاہ فہد کے صدام سے گھرے ذاتی دوستانہ تعلقات تھے۔ ایران کے خلاف عراقی عرب قوم پرستانہ

جنگ اور جمعی اتحاد کی وجہ سے نہیں، بلکہ اس سے بھی بہت پہلے سے یہ تعلقات تھے۔ شاہ نجد نے ہم سے خود یہ بات کہی کہ "پوری عرب لیڈر شپ میں میرا سب سے گھرا اور ذاتی دوست صدام تھا۔" لیکن یہ راستہ انہوں نے اختیار نہیں کیا یا نہیں کر سکے یا اختیار نہیں کرنے دیا گیا۔ یہ اقدام عراقی فوجوں کی میدان پیش قدمی کے امکان کو روک سکتا تھا۔

دوسری چیز یہ سامنے رہے کہ عرب لیگ کا سربراہی اجلاس ۱۹ اگست کو ہوا، جس میں پہلا خطاب مصر کے صدر حسنی مبارک کا تھا۔ صدر مبارک نے عرب علاقوں میں بیرونی فوجوں کے آنے کی مخالفت کی اور کہا کہ یہ "عربوں کا علاقائی مسئلہ ہے، اس میں علاقائی قوتوں ہی کو آنا چاہیے، اس میں غیر ملکی فوج کو نہیں بلانا چاہیے۔"

سوال: میرا خیال ہے معیاری صورت حال بھی یہی ہوتی؟  
جواب: معیاری یا غیر معیاری کی بحث کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ یہ دیکھئے کہ بحرانی صورت حال پیدا ہو چکی ہے اور ۱۹ اگست کو صدر حسنی مبارک جو اس میٹنگ کے چیئرمین اور میزبان ہیں، وہ یہ بیان دیتے ہیں۔ اس کے بعد ۱۰ اگست کو جو آخری اعلامیہ آتا ہے وہ یہ ہے کہ "اتحادی فوجیں آئیں گی، مدد دیں گی اور اس میں ہم شریک ہوں گے۔" یہ عرب لیگ کی تاریخ کی واحد قرارداد ہے جو انگریزی میں لکھ کر منظور کی گئی ہے اور بعد ازاں اس کا عربی ترجمہ جاری ہوا ہے، ورنہ آج تک عرب لیگ کی کوئی قرارداد ایسی نہیں ہے کہ جو پہلے عربی میں تیار نہ ہوئی ہو اور بعد میں انگریزی میں اس کا ترجمہ نہ کیا گیا ہو۔ بر حال سوال یہ ہے کہ ان چوبیس گھنٹوں میں آخر کون سا انقلاب واقع ہو گیا تھا کہ جس کی بنا پر بالکل مختلف راستے کا انتخاب کر لیا گیا۔ بہتر ہوتا کہ اگر یہ چار پانچ عرب ملک ہی مل جاتے اور اپنے ساتھ پاکستان یا ترکی کو ملا لیتے تو کیا امریکہ کے بغیر ایک اعلیٰ صورت حال پیدا نہیں ہو سکتی تھی؟ کیا یہ ممالک اقوام متحدہ پر زور نہ دے سکتے تھے کہ وہ اپنی امن فوجیں واپس لے لیں اور ایسی امن فوجیں اقوام متحدہ نے پہلے بھی مختلف مواقع پر مختلف جگہوں پر بھیجی ہے۔

سوال: تو آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ امن فوجیں کویت کو عراقی افواج سے خالی کرا لیتی؟

جواب: یہ اگست کی بات ہے، ابھی کویت کے بیرونی امداد کے ذریعے خالی کرنے کا کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ بلکہ ان کے بقول مسئلہ سعودی عرب کے دفاع کا تھا۔

سوال: یہ سعودی عرب کے دفاع اور کویت سے عراق کے انخلاء کا بھی تو مسئلہ تھا؟

جواب: یہیں پر تو آپ معاملے کو Confuse (گڈمڈ) کر رہے ہیں۔ اگست میں اصل مسئلہ کویت کے خالی کرانے کا نہیں تھا، اصل مسئلہ یہ تھا کہ سعودی عرب صدام کی متوقع دست برد سے محفوظ ہو۔ عرب لیگ کی قرارداد، یو این او کے ریزولوشن، صدر بش اور شاہ فہد صاحب کے بیانات پڑھ لیجئے، ان کے مطابق ہمیں بھی کویت کو خالی کرانے کے لیے امریکی افواج سعودی عرب میں نہیں آئی تھیں۔

سوال: عرب لیگ کی قرارداد تو آئی تھی کہ کویت کو عراق خالی کر دے؟

جواب: یہ مبنی برحق مطالبہ اپنی جگہ پر تھا۔ یہ مطالبہ ہم نے بھی کیا اور دوسرے لوگوں نے بھی، لیکن دیکھیں امریکی فوجیں کیوں بلائی گئیں؟ یہ فوجیں دراصل بلائی گئیں تھیں، صرف سعودی عرب کے دفاع کے لیے۔

سوال: چونکہ صدام حسین نے کویت کو عراق میں ضم کر لیا اس لیے سعودی حکومت یہی سمجھتی تھی کہ ہمیں اب کوئی عراق سے بچا نہیں سکتا اور نہ کویت کو آزاد کرا سکتا ہے، لہذا امریکہ کو دعوت دے دی گئی یا امریکہ نے زبردستی دعوت حاصل کر لی؟

جواب: اس میں تو کوئی اختلاف رائے نہیں ہے کہ کویت پر عراقی قبضہ نہایت غلط اور فاسقانہ اقدام تھا اور اس پر ساری قراردادیں یہ تھیں کہ عراق کویت کو خالی کرے۔ لیکن نومبر میں مسئلے نے یہ رخ اختیار کیا کہ "کویت کو خالی کرانے کے لیے قوت کا استعمال کیا جائے گا"۔ جب کہ امریکی فوج تو سعودی عرب کے دفاع کے لیے بلائی گئی تھی۔ اس ضمن میں، میں امریکی صدر بش کے الفاظ آپ کو سنا تا ہوں:

I have drawn a line on the sand and that is between the borders of Kuwait and Saudi Arabia.

تو بنیادی چیز یہ ہے کہ امریکی اتحادی فوج دفاع کے لیے تھی، انخلاء کے لیے نہیں تھی۔ یہ تبدیلی دوماہ کے بعد نومبر میں آئی۔ پھر یہ کہا کہ "دیگر ذرائع استعمال کیے جائیں" آخر میں کہا

کہ "فورس استعمال کی جائے" جو کہ سلامتی کو نسل میں دسمبر کی قرارداد ہے۔ یہاں پر سعودی عرب کے دفاع کا سوال نہیں اٹھایا گیا، حالانکہ فوجوں کی آمد وہاں پر کویت کو خالی کرانے کے لیے نہیں تھی، بلکہ سعودی عرب کے دفاع کے لیے تھی۔ سعودی عرب اپنے دفاع کے لیے امریکہ کی بجائے عرب اور دوسرے مسلم ممالک جو کہ تعاون کرنے کے لیے تیار تھے طلب کرتا تو مجھے یقین ہے کہ اس معاملے میں الجزائر بھی تعاون کر رہا ہوتا۔

سوال: الجزائر میں تو اگست کے دوران میں ہی باللہ اپنی جلاوطنی کو چھوڑ کر وہاں گئے ہیں۔

جواب: الجزائر اور بن باللہ ایک چیز نہیں ہیں۔ اگر واقعات اور صورت حال کے موازنے میں احتیاط برقی جائے گی تو اور زیادہ حقیقت پسندانہ صورت سامنے آئے گی۔ خرما اور سیاسی اعتبار سے بھی امریکی فوجوں کے بلانے کو ہم عراق کے کویت پر قبضے ہی کی طرح امت مسلمہ پر ایک بڑا ظلم سمجھتے ہیں۔

سوال: کیا شرعی نقطہ نظر سے کسی مسلم ملک کے لیے غیر مسلم ملک کی فوجیں بلانا منع ہے؟

جواب: جی ہاں بالکل! خاص طور پر جب حالت ایسے ہوں کہ آپ بالادست نہ ہوں، ایسی فوجی قوت کی کمان آپ کے ہاتھ میں نہ ہو فیصلہ آپ نہ کر رہے ہوں۔ اور اگر وہ غیر مسلم افواج آپ کے تابع اور آپ کے زیر کمان نہ ہوں تو فقہاء کے نزدیک ایسا امدادی فوجی پروگرام جائز نہیں۔ فقہانے پر مبنی ایسی مثال دی ہے کہ جس طریقے سے شکار کے لیے آپ کا استعمال کر سکتے ہیں، اسی طریقے سے آپ جنگ کے اندر غیر مسلم فوجی قوت کو بھی استعمال کر سکتے ہیں کہ جس میں وہ آپ کے تابع ہوں، لیکن اس شکل میں اجازت نہیں ہے کہ وہاں پر حکم اور کمان غیر مسلمانوں کی ہو فیصلہ وہ کریں اور خود آپ ان کے تابع فرمان ہوں، اس امر کی اجازت اسلامی شریعت نہیں دیتی۔ اس پہلو سے اسلامی تحریکوں کے موقف کو مدکورہ اور حقیقی فریم ورک کے اندر دیکھا جائے تو بات سمجھ میں آسکتی ہے۔ البتہ ظلمی جنگ کو اس تناظر میں نہ دیکھا جائے جو مغرب نے اپنے پرولیمینڈس کے زور پر ہمارے لیے تشکیل دیا ہے۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ اسلامی تحریکات کے لیے ضروری ہے کہ اس پورے واقعے اور اپنے موقف کا کھلے دل سے تجزیہ کریں۔

اس معاملے میں ہمارے لیے ایک بہت بڑا سبق ہے۔ جہاں اسلامی تحریکوں کو بیرونی سازشوں اور اسکیموں کا مقابلہ کرنا چاہیے وہیں، مسلم ممالک کی سیاسی اور مقتدر قیادت کی کمزوریوں کا بھی تنقیدی سطح پر جائزہ اور آک اور عوامی سطح پر ہمہ گیر ابلاغ کرنا چاہیے۔ عراق، کویت، سعودی عرب، ایران، مصر اور دوسرے مسلم ممالک سے اس معاملے میں جو عدم اعتیاد ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ اس پورے تناظر میں وہ مغربی اقوام کے سامراجی عزائم اور ملے کے مضمرات کو قرار واقعی اہمیت نہیں دے سکے۔ میں نے سینیت کی تقریر میں بالکل کھلے انداز میں صدام حسین پر واضح تنقید کی۔ یہ میرے دل کی آواز تھی اور جنگ شروع ہونے کے ایک ہفتے کے دوران میں ہوئی تھی۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ امت مسلمہ کے مستقبل کا معاملہ ایسے غبی، دہل، ہمت، اقتدار پرست اور بصیرت سے عاری لوگوں کے ہاتھوں میں ہے، جو اس قسم کی حماقتیں، غلطیاں اور ظلم روار کھنٹے میں کوئی ہاک محسوس نہیں کرتے۔

سوال: جیسی غلطیاں کہ صدر صدام اور شاہ فہد کرتے رہے؟  
جواب: ایک دو پر کیا منحصر ہے یہ آج مسلمانوں کی ساری سیاسی لیڈر شپ کا مسئلہ ہے۔ مثلاً صدام اگر فی الحقیقت انہیں سکتا تھا تو پھر کیا چیز مانع تھی کہ اُس نے جہد اور پندرہ جنوری ۱۹۹۱ء کو فرانسیسی صدر مٹراں اور سویت یونین کے صدر گورباچف کی بات قبول نہیں کی۔ محتسبوں کے نزدیک ہمارا جرم یہ ہے کہ ہم نے امریکی مداخلت بلکہ امریکی ہمدردی کے پردے میں مغرب کے استعماری عزائم کو بے نقاب کیا اور درست کیا۔ لیکن افسوس کہ یہاں بھی وہی تاریخ دہرائی گئی کہ مسلمانان ہند نے تو خلافت عثمانیہ کے تحفظ کے لیے جان و مال کی بازی لگا دی اور دوسری طرف نوجوان ترک قیادت، خلافت عثمانیہ کی عبا پاک کر رہی تھی، کم و بیش یہی معاملہ عراق میں بھی ہوا۔

دوسری طرف اتحادیوں کے حلیف عرب ممالک میں بھی یہ ہوا، کہ وہ شخصی حکومتوں کی حفاظت کے بدلے میں بڑی حد تک اقتدار اعلیٰ سے تہی دامن ریاستوں کا استعارہ بن کر رہ گئے ہیں۔ گویا کہ دونوں جانب مسلم سیاسی قیادت کے ہاتھوں مسلم ممالک کی تصویر بڑی مایوس کن ہے۔ ان حکمرانوں نے ان ہندوستانی راجوں جیسا رول ادا کیا، جنہوں نے اپنے جھگڑے منٹانے کے لیے پہلے خوشی خوشی ایسٹ انڈیا کمپنی کو مدد کے لیے پکارا، اور پھر اپنا اقتدار اعلیٰ بھی گنوا

دیا اور کچھ سماں بھی کچھ ایسے ہی انداز سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی جگہ امریکہ آیا ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ آج مسلم ممالک کی سلامتی، اقتدار اعلیٰ اور مادی وسائل نصرانیوں کے ساتھ ساتھ نہہ سود میں پھنس چکا ہے، میں۔ پاکستان، ایران، سوڈان وغیرہ کو دہشت گرد ممالک قرار دینے کی دھمکیاں، ان کے دفاعی پروگراموں کو اڑا دینے کے عزم، ان کے باعمل مسلمان شہریوں کے بنیادی حقوق پر قدغن، کشمیر میں قتل عام پر خاموشی، الجزائر میں مسلمانوں کے لوگوں کی ارضانی، فلسطین کے اصولی مسئلے کو بندر ہانٹ کے ذریعے اڑانے کا اقدام، بوسنیا کے مسلمانوں کا حسرت ناک انجام، یہ سب کیا ہے؟ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ یہ جو بری تبدیلی مسلمانوں کے اس مرکزی علاقے میں امریکیوں کی بھرپور فوجی آمد کے ساتھ رونما ہوئی ہے۔

### سود کا چیلنج اور اسلامی تحریک

سوال: بنیاد پرستی یا اسلامی راسخ العقیدگی کو مسلمانوں کے لیے آپ نے واحد متبادل کے طور پر پیش کیا ہے اور نوآبادیاتی دور کے بعد استعماری طاقتیں یہاں جو ریاستی ڈھانچہ دے کر گئیں اور کاروبار ریاست چلاتے کے لیے جو لوگ انہوں نے پیدا کیے وہ بھی ناکام ہو چکے ہیں۔ اسی کے مد مقابل بنیاد پرست قوتیں ایک متبادل نظام کی نوید سنا رہی ہیں۔ جس کے لیے مسلمانوں میں کشش بھی پائی جا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے مغرب کی طاقتیں اس سے خائف ہیں۔ مگر یہ ایک پختہ تاثر ہے کہ بنیاد پرست قوتوں کے پاس کوئی قابل اعتماد معاشی نظام نہیں ہے۔ اس ضمن میں بڑی رکاوٹ سود کا مسئلہ ہے۔ پاکستان میں ایک نیم دلائلہ کوشش ہوئی۔ لیکن وہ آخر سودی نظام کی اتباع پر منتج ہوئی۔ پرائیویٹ سیکٹر میں انڈسٹریلائزیشن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ کمرشل انٹرسٹ کے بغیر نہیں چل سکتیں اور کمرشل انٹرسٹ Usury نہیں۔ اس چیز نے مسلمانوں کے روشن خیال طبقے کو بھی متاثر کیا ہے۔ آج صورت حال یہ کہ معیشت کی اسلامی تشکیل کے لیے اسلامی قوتوں کے پاس کوئی متبادل پروگرام نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک بڑی ناکامی ہے؟



جواب: آپ کے پیش کردہ ان مفروضوں سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ محرطل اثر سٹ اور Usury دو الگ چیزیں نہیں ہیں۔ Usury محض ایک اصطلاح ہے جو مغرب کے لوگ دھوکہ دینے اور کشفیوز کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ تاکہ سود اور Usury میں فرق کیا جاسکے، حالانکہ فنی اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسی طرح میں اس بات سے بھی اتفاق نہیں کرتا کہ اسلامی لشاہ ثانیہ کی تحریکوں کے پاس کوئی معاشی پروگرام نہیں ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ ہم اپنا معاشی پروگرام ابھی تک اتنی تفصیل کے ساتھ اور اتنے دلائل سے عام لوگوں کے سامنے نہ رکھ سکے ہوں کہ ہر شخص اس سے مطمئن ہو جائے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم نے اپنی معاشی اپروچ بالکل پیشہ وارانہ انداز میں پیش کی ہے۔ ہم نے وضاحت کی ہے کہ ترقیاتی حکمت عملی (ڈیولپمنٹ اسٹریجی) کیا ہونی چاہیے؟ ہم نے بتایا ہے کہ فراہمی روزگار کا مسئلہ کس طرح حل ہو سکتا ہے؟ ہم نے رہنمائی کی ہے کہ میکوں کے نظام میں اصلاحات کیا ہوں گی؟ ہم نے بتایا ہے کہ ملکیت کے معاملات کیسے طے ہوں گے؟ ہم نے بتایا ہے کہ سود کو کس طرح ختم کیا جاسکتا ہے؟ پھر پرائیویٹ قرضوں اور محرطل قرضوں کے لیے ہم نے بارہ متبادل طریقے مرتب کر کے دیے ہیں اور پرائیویٹ سیکٹر میں ان میں سے کچھ پر عمل کر کے بھی دکھلایا ہے۔ یہ سارا کام احیاء اسلام کی تحریکوں نے کیا ہے۔ لیکن ہماری اصل مشکل یہ ہے جو افراد برسرِ اقتدار رہے ہیں، وہ اس پر یقین نہیں رکھتے کہ اس پالیسی کو رائج کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس پالیسی پر نہ عمل ہوا ہے اور نہ اس پالیسی کی طرف بڑھنے کے لیے کوئی پیش قدمی یا کوئی موثر کوشش کی گئی ہے۔

اگر میں صورت حال کو تاریخ کی ایک مثال سے واضح کروں تو کہتا ہوں کہ علامہ اس مرحلے پر ہیں کہ جس مرحلے میں ۱۹۱۷ء سے پہلے اشتراکی نظریہ تھا۔ اس کے پاس ایک پروگرام ضرور تھا، لیکن اس کے پاس وہ ریاستی طاقت نہیں تھی کہ جس کے بل پر وہ اس کو نافذ کر سکے۔ اس بنا پر کسی کا یہ کہہ دینا کہ اسلامی تحریکوں کے پاس کوئی پروگرام نہیں ہے، یہ قطعی طور پر حقائق کے منافی بات ہے۔ میں پورے یقین سے یہ بات کہتا ہوں کہ اگر ہمیں اللہ تعالیٰ یہ موقع دے تو ہم ایک لمحہ صنائع کیے بغیر پہلے دن سے اپنے نصب العین کی طرف تدبیر کے ساتھ پیش رفت کریں گے۔ اس نظام کو تبدیل کرنے میں کتنا وقت لگتا ہے، اس کے لیے ایک عبوری اور عارضی مدت ناگزیر ہے اور یہ عبوری دور خود شریعت نے قبول کیا ہے اور اگر نیت درست ہے تو یہ کوئی عیب نہیں ہے۔ اور یہ اضطراری چھوٹ ہمارے پروگرام کے اندر موجود ہے۔ سود

کے معاملے میں تو آج اتنا کام ہو چکا ہے کہ بہت سے غیر مسلم ماہرین معاشیات بھی اس امر کا اظہار کر رہے ہیں کہ غیر سودی نظام ایک قابل عمل چیز ہے۔ لیکن چونکہ وہ عملاً موجود نہیں ہے اس لیے آپ اگر اس پر عمل نہیں کریں گے تو دوسرے کس طرح اُسے تسلیم کریں گے؟ اسی طرح جو اسلامک بینک قائم ہوئے ہیں، وہ صرف ایک جزوی تجربہ ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ وہ پرائیویٹ سیکٹر کے اندر ہیں اور دوسری چیز یہ ہے کہ انہوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ ایک عام شہری کے لیے سود سے پاک کچھ سولتیں فراہم کریں۔ جب تک اس کے چمکے ریاستی قوت موجود نہ ہوا اسے پوری طرح پیش نہیں کیا جاسکتا۔

پاکستان کے چھٹے پانچ سالہ منصوبے کے موقع پر انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد کی طرف سے ہم نے ایک ماڈل دیا کہ اسلامی فریم ورک میں ترقیاتی حکمت عملی کیا ہونی چاہیے اور میرے خیال میں پاکستان میں منصوبہ سازی کی جتنی دستاویزات آج تک آئی ہیں، ان سب پر وہ حادی ہے۔ بعد ازاں اسی طرح کی ایک اور دستاویز پیشہ وارانہ انداز میں تیار کر کے "خود انحصاری کمیٹی" کی رپورٹ میں نے اس وقت پاکستان کے وزیر اعظم میاں محمد نواز خریف صاحب کو دی تھی، جس میں دو اور دوپار کر کے دکھایا ہے کہ سود کا خاتمہ کیوں کر ممکن ہے، اور یہ کس طریقہ سے کیا جاسکتا ہے لیکن میاں صاحب نے اس رپورٹ کو بھی پارلیمنٹ میں پیش نہیں کیا۔ بہر حال ایسا نہیں ہے کہ ہم غلام میں بیٹھے بس بیانات دے رہے ہیں اور غور و فکر اور عملی پیش رفت کا کوئی کام نہیں کر رہے ہیں۔ لیکن ناکامی کا اصل باعث یہ ہے کہ مسلم ممالک میں اقتدار ان لوگوں کے پاس ہے جو اسلامی نظریے سے وابستگی سے خرماتے ہیں۔ باقی کسی بھی چیز کے نفاذ میں مشکلات تو ہوتی ہیں، یہ مشکلات خود سرمایہ دارانہ اور فلاحی ریاستی نظریہ کے علم برداروں کو بھی درپیش ہیں، جبکہ ان کے پاس قوت، وسائل اور وقت بھی موجود ہے۔ اسی طرح ہمیں بھی مشکلات پیش آسکتی ہیں۔ جن کا ہمیں پورا پورا ادراک ہے اور ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ اپنے فریم ورک میں ہم ان شاء اللہ ان مشکلات کا حل نکال لیں گے۔

پرائیویٹائزیشن، اسلامی ترقیاتی حکمت عملی کا ایک حصہ بھی ہو سکتا ہے اور خالص سرمایہ دارانہ نظام نہ تمام کو لانے کا آہ کار بھی بن سکتا ہے۔ ہم ان دونوں چیزوں میں فرق کرتے ہیں۔ اس کو خالص سرمایہ دارانہ نظام نہ تمام دوبارہ مسلط کرنے کا ایک جواز نہیں بننا چاہیے۔ ہم چاہتے

1. [ed: Khurshid Ahmed and Others] "Elimination of Riba from the Economy" (1994), Khurshid Ahmad "Development Strategy; Islamic Approach" (1994) and "Development Strategy for the Sixth Five Year Plan" (1983), Institute of Policy Studies, Islamabad.



ہیں کہ پرائیوٹائزیشن درست اور شفاف طریقے سے ہو جس کے ذریعے ہم اسلامی عدل قائم کر سکیں اور ایک عادلانہ نظام کی طرف قدم بڑھا سکیں۔ ہماری سوچ میں اور سرمایہ دارانہ سوچ میں یہی بنیادی فرق ہے۔ اس وقت ہم ایک نئی اسٹڈی لائے ہیں، جس میں پوری مسلم دنیا کو سامنے رکھ کر ہم نے بتایا ہے کہ غربت کے خاتمے کی اسلامی حکمت عملی کیا ہے۔

### پرائیوٹائزیشن اور اسلامی معاشی حل

سوال: آپ نے کہا ہے کہ "پرائیوٹائزیشن" اسلامی معاشی پروگرام کو نافذ کرنے کے لیے ایک وسیلہ بھی ہو سکتی ہے اور ظالمانہ سرمایہ دارانہ نظام آلہ کار بھی بن سکتی ہے۔ گویا کہ اسلام پوری معیشت کو سرکاری یا پبلک سیکٹر میں نہیں رکھتا، بلکہ پرائیوٹائزیشن کا اس میں غالب حصہ ہوتا ہے۔ صدر محمد ضیاء الحق کے دور میں ایک رپورٹ آئی تھی کہ سود کو اس وقت تک ختم نہیں کیا جا سکتا، جب تک کہ ملکی معیشت مکمل طور پر سرکاری تحویل میں نہ لے لی جائے۔ اگر ہم نے نجی شعبے کا رول رکھنا ہے اور اس کو غالب کردار دینا ہے تو پھر سود سے کوئی مفر نہیں؟

جواب: نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ اس وقت یچ یو بیگ صاحب (وفاقی فنانس سیکرٹری) کی صدارت میں بننے والی کمیٹی میں ڈاکٹر فواب حیدر لقوی صاحب اس رپورٹ کے مرکزی صورت گرتھے۔ لیکن یہ رپورٹ کبھی گورنمنٹ نے قبول نہیں کی اس لیے ظاہر بات ہے کہ یہ پالیسی نہیں بنی۔ میں نے اس رپورٹ کا بھی محاکمہ کیا تھا۔ نیز اس رپورٹ کی جو تجویز آپ نے اپنے سوال میں پیش کرنے کی کوشش فرمائی ہے وہ بھی مضفانہ نہیں ہے۔ پوری معیشت کو سرکاری تحویل میں دینے کی بات درست نہیں۔ بلاشبہ اس رپورٹ میں "مشاربہ" اور "مشارکہ" کی بنیاد پر تبدیلی کو تنقید کا لٹانہ بنایا گیا ہے، مگر اس سے وہ نتیجہ نہیں نکلتا جو آپ نکال رہے ہیں۔ پھر بعد کی متعدد تحریروں میں اس رپورٹ کے اصل مصنفین نے بھی نجی شعبے کے رول کے بارے میں اس موقف سے ہٹ کر بات کی ہے، جو اصل رپورٹ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس لیے اس رپورٹ کی حیثیت بس ایک رائے کی ہے، اس سے زیادہ نہیں۔

مبنی ہے۔ سب سے پہلا معاملہ یہ ہے کہ مقتیان مغرب نے بنیاد پرست کے معنی یہ وضع کئے ہیں کہ ”وہ ترقی کا دشمن ہو، دور حاضر کے تضامین کو نظر انداز کرنے والا ہو یا اسلام کی کسی ایسی تعبیر سے چپکا ہو جس کی بنا پر اسلام وقت کے چیلنجوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔“ امر واقعہ کے اعتبار سے یہ انتہائی غلط، ایک رفا بد نیتی پر مبنی اور مبالغہ آمیز پریلیمنڈ ہے۔ البتہ اس سے پہلے مغرب کے مستشرقین (Orientalists) نے مسلمانوں کے ہاں بنیاد پرست کی اصطلاح ان لوگوں کے لیے استعمال کی ہے جو یہ چاہتے ہیں کہ اسلام جیسا کہ وہ ہے اور جیسا کہ مسلمان اس کو سمجھتے ہیں، اسے اس کی بنیادی روح کے مطابق نافذ کرنا چاہتے ہیں دراصل وہ بنیاد پرست ہیں۔

مغرب یہ چاہتا ہے کہ اسلام کا نام تو چاہے رہے، جس طرح کہ عیسائیت کا نام باقی ہے۔ لیکن فیصلہ کرنے کا اختیار اللہ کی کتاب، الہامی ہدایت اور اسوہ رسول آخر الزماں ﷺ کا حاصل نہ ہو۔ بلکہ انسان اپنی ذاتی مرضی، بدلتے ہوئے اغراض اور مقاصد کی روشنی میں ان معاملات کو مغربی پیمانہ فکر کے مطابق طے کرے۔ نیز یہ کہ جس چیز کو اہل مغرب پسند کرتے ہیں، بس آنکھیں بند کر کے وہ قبول کی جائے۔ اسی کے اندر مسلمان ڈھل جائے تو یہ ”ترقی پسندی، تعمیر پسندی، عقل مندی، اور میانہ روی“ ہے۔ اور اگر قرآن و سنت کی بنیاد پر مسلمان اپنے اصول، اپنے نظریے، اپنی روایات، اپنی تاریخ اور خود اپنی تہذیب پر عمل کرنا چاہے تو یہ ”بنیاد پرستی“ ہے۔ یہ بات مغربی دانشوروں کی ان تمام تحریروں میں نمایاں ہے، جو کہ آج مغرب سے آرہی ہیں۔ پروفیسر منٹگری واٹ ایک مشہور مستشرق ہیں، انھوں نے حال ہی میں بہت کھل کے یہ بات کہی ہے: ”در اصل اسلام کا جو روایتی تصور یعنی وہ تصور جو قرآن اور نبی پاک ﷺ نے پیش کیا ہے، اس کو پیش کرنے والے لوگ ہی بنیاد پرست ہیں۔ اور جو لوگ اسلام کو مغرب کے معیار پر بدلنے اور ڈھالنے کے لیے تیار ہیں، وہ لبرل ہیں اور وہی ہمارے اصل دوست ہیں۔“

اب یہ دیکھا جاسکتا ہے کہ علامہ محمد اقبال اور قائد اعظم محمد علی جناح کا موقف اس ذیل میں کیا تھا؟ علامہ اقبال کا آپ مطالعہ کر لیجئے۔ اقبال نے جدید اور قدیم دونوں علوم کے ماخذ سے استفادہ کیا اور پوری قوت ایمانی کے ساتھ یہ بات کہی کہ اسلام حق ہے اور مغرب جس بنیاد پر قائم ہے یعنی سیکولرازم، نیٹلزم، ریشٹلزم، سائنس پرستی... یہ بنیاد، بنیاد خدام ہے۔

علامہ محمد اقبال نے اسلام کو ایک انقلابی تصور کی حیثیت سے پیش کیا۔ اس سلسلے میں اگر آپ اقبال کے شعر کو جو ان کی فکر کے اظہار کا اصل میڈیم اور پیمانہ رہا ہے، نظر انداز بھی کر دیں تب بھی صرف ”سال نو کا پیغام“ دیکھ لیجئے جو انھوں نے اپنی وفات کے سال یکم جنوری

ایک شے کی خرید اور فروخت کی دو قیمتیں ہو سکتی ہیں بشرطیکہ اس میں زمانی فرق ہو۔ مثلاً فرض کریں کہ کاغذ کی آج قیمت پانچ ہزار ڈالر فی ٹن ہے اور آپ کے پاس کاغذ ہے، آپ کہتے ہیں کہ اگر تم آج یہ کاغذ لیتے ہو تو پانچ ہزار ڈالر فی ٹن ہے، لیکن اگر تم یہ لے کر ایک سال کے بعد ادائیگی کرو گے تو پانچ ہزار کا نہیں بلکہ پانچ ہزار دو سو ڈالر کافی ٹن ہو گا۔ آپ کو اس بات کا اختیار ہے کہ اس سے آپ اس قیمت پر خرید لیں جو آج سے ایک سال بعد کی ہو گی۔ اس کے لیے جو ادائیگی آپ نے کرنی ہے ایک سال بعد کریں گے، یعنی پیسہ سودا کیا جا سکتا ہے اور مستقبل کی قیمت میں فرق ہو سکتا ہے۔ یعنی "مراجمہ" شافعیہ کی اصطلاح ہے، فقہا حنفیہ نے "بیع مؤجل" کا راستہ کھلا رکھا ہے۔ اس میں بھی یہی شکل ہے کہ اس کی قیمت مختلف ہو سکتی ہے، لیکن جو صورت نہیں ہو سکتی وہ یہ ہے کہ آپ ایک چیز بچ کر اسے تبدیل نہیں کر سکتے۔ فروخت عملاً ہونی چاہیے یہ نہیں کہ وہ ایک تقرری فروخت ہو۔ اسی طرح اگر بروقت قیمت آپ کو نہ مل سکے تو اس میں مزید اضافہ نہیں ہو سکتا خواہ ادائیگی میں کتنی ہی تاخیر کیوں نہ ہو۔

اسی طرح فقہ نے چند دوسری شرائط بھی رکھی ہیں، جن سے معاملہ سود سے مختلف ہو جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عملاً جیسا "مارک اپ" ہمارے بنگلوں میں رائج ہے، اس میں ان شرائط کو ملحوظ نہیں رکھا جا رہا۔ اس طرح یہ "مارک اپ" مراجمہ یا "بیع مؤجل" نہیں بلکہ عملاً سود ہی کی ایک شکل بن آ گیا ہے اور صرف نام اور عنوان کو تبدیل کیا گیا ہے۔ "مراجمہ" اور "بیع مؤجل" کے احکام پر عمل نہیں ہو رہا۔

سوال: آپ اس میں "خاص حالات" کی اصطلاح استعمال کریں گے یا اضطراری حالات کی؟

جواب: میرے علم کی حد تک فقہاء نے "اضطرار" کا لفظ استعمال نہیں کیا، وہ اسے "خاص حالات" کہتے ہیں، اسی لیے ہمارے کچھ فقہاء یہ کہتے ہیں کہ "جس چیز کی اہازت ہے وہ عموم بھی ہو سکتا ہے"۔ لیکن یہ بات بھی گئی ہے کہ یہ اہازت خاص صورتوں ہی میں پیش نظر ہے، اس کی عام اہازت نہیں ہو گی اور "اسلامی تقریباتی کونسل" نے بھی اپنی رپورٹ میں یہی بات کہی ہے۔ یعنی غیر معمولی حالات میں اس کی اہازت ہو سکتی ہے اور تجارت کی چند وقتی ضروریات کی بنیاد پر یہ راستہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔

سوال: کیا اس طرح سود کو تسلیم کرنے کا ایک طریقہ نہیں نکل

آئے گا؟

جواب: یہی تو جو رہا ہے اور اسی بنا پر ہم نے اور خود اسلامی نظریاتی کونسل نے اس راستے کے اختیار کیے جانے سے واضح الفاظ میں اختلاف کیا ہے۔

سوال: میں نے پڑھا تھا کہ مولانا مودودی، نقد اور ادھار قیمتوں کے فرق کو تسلیم نہیں کرتے تھے؟

جواب: ایک تو وہ فقہا ہیں جو فقہ کی کتاب پر انحصار کرتے ہیں۔ انہوں نے دیکھا کہ یہ ہمارے فقہی مسلک کی کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ یہ کرنے کا راستہ ہے اس لیے یہ کر دو۔ لیکن جو افراد فقہ والے ہیں ان سب نے یہ بات کہی ہے کہ قیمتوں کے اس فرق میں "شبہ رہا" موجود ہے۔ (وہ اسے "رہا" نہیں بلکہ "شبہ رہا" کہتے ہیں)، اس لیے اس میں احتیاط برتنی چاہیے۔

علامہ اقبال اور قائد اعظم کا تصور پاکستان اور تحریک اسلامی

سوال: بانیان پاکستان یعنی علامہ اقبال اور قائد اعظم نے ایک جدید اسلامی جمہوری ملک کا خواب دیکھا تھا۔ وہ ان معنوں میں "بنیاد پرست" نہ تھے جس میں آج کل یہ اصطلاح استعمال اور آپ حضرات پر منطبق کی جا رہی ہے۔ آپ جس طرح کا پاکستان تعمیر کرنا چاہتے ہیں، غالباً وہ بانیان پاکستان کے خواب کے مطابق نہیں؟

جواب: اس ضمن میں سب سے پہلے ایک اصولی بات پیش نظر رہنی چاہیے اور وہ یہ ہے کہ اس کائنات کا خالق، رب اور روز جزا کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ جس نے انسانیت کے لیے آخری ہدایت کے طور پر قرآن پاک نازل فرمایا، اور اپنی ہدایت کی تکمیل کے لیے قاتم الانبیاء حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا۔ اس لیے ایک مسلمان کی پوری زندگی، چاہے وہ دنیا کے کسی بھی خطے میں، کسی بھی حالت میں گزرے، ان کے لیے بنیادی سرچشمہ ہدایت اور آخری معیار حق قرآن و سنت رسول ہے۔ دیگر محترم سے محترم اور فاضل سے فاضل شخصیات کا مقام نہ صرف لازمی طور پر ان کے بعد میں آتا ہے، بلکہ ان کی آراء، افکار اور فیصلوں کو قرآن و سنت ہی کی کوئی نہ پرکھا جانے گا۔

اب میں آپ کے بنیادی سوال کی طرف آتا ہوں۔ یہ سوال بھی چند در چند مغالطوں میں

کے دیے ہوئے اصولوں کے مطابق قائم کریں۔ میں اس سلسلے میں قائد اعظم کی آخری پانچ سال کی تقریروں کی طرف توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں، جس سے معلوم ہو گا کہ قائد اعظم کا اس معاملے میں کیا موقف تھا۔

جہاں تک جدید اسلامی جمہوری ملک کا تعلق ہے، اس ضمن میں علامہ اقبال اور قائد اعظم جس بات کے حامی، اور علم بردار تھے اور جس بات کے لیے انہوں نے بھرپور جدوجہد کی وہ قرآن و سنت کی لاثانی اور ابدی ہدایات کی روشنی میں ایک مسلمان معاشرے اور ایک مسلمان ریاست کا قیام عمل میں لانا تھا۔ ایسا معاشرہ جو عمرانی عدل (Social Justice) کے تقاضوں کو پورا کر سکے اور جس میں اسلام کا قانون ہماری و ساری ہو۔ جس میں مسلمان مغربی اقوام کی غلامی اور ان کی تعالیٰ کی بھائے اسلام کو بطور دین ہدایت اور مستقل کلچر کی حیثیت سے پیش کریں، یہ تھا بانیان پاکستان کا تصور — وہ لوگ کہ جو اس سے ہٹ کر چل رہے تھے ان کے اوپر علامہ اقبال اور قائد اعظم نے گرفت کی اور خصوصیت سے ترکی پر، جو اپنے آپ کو یورپ کے سانچے میں ڈھالنے میں مصروف تھا۔

بالکل یہی وہ تصور ہے جس کو جماعت اسلامی نے پیش کیا ہے۔ جسے آج یہ لوگ "اسلامی بنیاد پرست" کہہ رہے ہیں۔ ہم دراصل قرآن و سنت رسول ﷺ سے ماخوذ اور اسلام کے تابع فکر اقبال اور قائد اعظم کے تصور کو حقیقت کے روپ میں ڈھالنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس اعتبار سے ہمارے اور بانیان پاکستان کے تصور میں کوئی فرق نہیں۔ بانیان پاکستان کے تصور سے وہ لوگ ہٹے ہیں، جنہوں نے اس ملک میں بے دینی، مادیت، مغرب پرستی اور اباحت کو رواج دیا، یا سوشلزم کی راہ جموں کی یا اس کے حاشیہ بردار بنے۔ جنہوں نے سرمایہ داری کو یہاں پر فروغ دیا، اور جنہوں نے جاگیر داری کے ناسور کو بڑھنے اور پھیلنے کے مواقع دیے۔ جو یہاں اسلامی قانون سے انحراف کے راستے تلاش کر رہے ہیں۔ جنہوں نے یہاں علاقائی اور لسانی عصبیتیں پیدا کیں۔ ہم تو ان تمام کا مقابلہ اللہ تعالیٰ پر ایمان، دلیل اور یقین محکم سے کر رہے ہیں۔ ہم دی لڑائی لڑ رہے ہیں جو علامہ اقبال اور قائد اعظم نے لڑی تھی۔ یوں ہمارے اور بانیان پاکستان کے درمیان کوئی فکری یا عملی تضاد اور تضاد نہیں۔

سوال: جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اقبال اور قائد اعظم تھیا کریسی کے مخالف تھے، مگر کہا جاتا ہے کہ آپ لوگ تو کہہ رہے ہیں کہ تھیا کریسی کی طرف لے جانا چاہیے ہیں؟

جواب: یہ امر واقعہ بھی ہے، اور اسی حقیقت کا اظہار علامہ محمد اقبال اور قائد اعظم محمد علی جناح دونوں نے کھل کر کیا ہے کہ اسلام تھیا کریسی نہیں ہے۔ کچھ لوگ ان بیانات کا سارا لے کر یہ بات کہنے کی کوشش کرتے ہیں کہ گویا کہ ہمارے اور ان کے موقف کے اندر فرق ہے۔ حالانکہ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ علامہ اقبال نے اس موضوع پر جہاں بحث کی ہے، وہ "خطبات" کا چھٹا خطبہ ہے۔ اس خطبے میں انہوں نے یہ بات اس معنی میں فرمائی ہے کہ "گویا بہ حیثیت ایک اصول، عملی توحید اساس ہے: حریت، مساوات اور حفظ نوع انسانی کی۔ اب اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو آرزوئے اسلام ریاست کا مطلب ہماری یہ کوشش ہو گا کہ یہ عظیم اور مثالی اصول زمان و مکان کی دنیا میں ایک قوت بن کر ظاہر ہوں۔ گویا ایک آرزو ہے ان اصولوں کو ایک مخصوص جمعیت بشری میں مشہود رکھنے کی۔ لہذا اسلامی ریاست کو حکومت النبی سے تعبیر کیا جاتا ہے تو انہی معنوں میں، ان معنوں میں نہیں کہ ہم اس کی زمام اقتدار کسی ایسے سلطان ظل الہی کے ہاتھ میں دے دیں، جو اپنی مفروضہ معصومیت کے عذر میں اپنے جو رو استبداد پر ہمیشہ ایک پردہ سا ڈال رکھے"۔ یعنی اسلام میں تھیا کریسی ان معنوں میں قطعی طور پر نہیں ہے کہ مذہب میں کوئی طبقہ اجارہ دار ہو اور بس وہی طبقہ اللہ کی مرضی کو جاننے کا واحد ذریعہ ہو۔ اسلامی تعلیمات اور اسلامی مزاج کی روشنی میں یہ فکر تھی علامہ اقبال کی۔

قائد اعظم نے یہ بات کہی ہے کہ تھیا کریسی کا میں مخالف ہوں، اس لیے کہ اسلام میں کسی ایسے طبقے کا تصور نہیں ہے کہ جو دین کا اجارہ دار ہو۔ جیسا کہ بدھ مذہب، عیسائیت، ہندومت میں اور یہودیت میں پایا جاتا ہے۔ یہ بات اسی معنی میں سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی نے ہمیشہ اسی لہجے میں کہی ہے کہ "ہم تھیا کریسی کے مخالف ہیں۔ تھیا کریسی کا کوئی تعلق اسلامی نظام سے نہیں ہے"۔ اس ضمن میں مولانا مودودی کے موقف کو جاننے کے لیے ان کی کتب سے اس بات کی تائید ہوگی۔ اب اگر کوئی پڑھا لکھا آدمی پڑھے بغیر محض مغرب کے عطا کردہ الزام، اور اہتمام کو عین علم قرار دینا چاہتا ہے تو یہ اس کی جہالت اور تنگ نظری کا

2. Dr. Mahammad Iqbal: The essence of Tauhid, as a working idea, is equality, solidarity and freedom. The state, from the Islamic standpoint, is an endeavour to transform the ideal principles into spacetime forces, an aspiration to realize them in a definite human organization. It is in this sense alone that the state in Islam is a theocracy, not in the sense that it is headed by a representative of God on earth, who can always screen his despotic will behind his supposed infallibility. "Reconstruction of Religious Thought in Islam". [ed: Saeed Sheikh] 1986, pp.122-123



کے دیے ہوئے اصولوں کے مطابق قائم کریں۔ میں اس سلسلے میں قائد اعظم کی آخری پانچ سال کی تقریروں کی طرف توجہ مبذول کرنا چاہتا ہوں، جس سے معلوم ہو گا کہ قائد اعظم کا اس معاملے میں کیا موقف تھا۔

جہاں تک جدید اسلامی جمہوری ملک کا تعلق ہے، اس ضمن میں علامہ اقبال اور قائد اعظم جس بات کے حامی، اور علم بردار تھے اور جس بات کے لیے انہوں نے بھرپور جدوجہد کی وہ قرآن و سنت کی لاثانی اور ابدی ہدایات کی روشنی میں ایک مسلمان معاشرے اور ایک مسلمان ریاست کا قیام عمل میں لانا تھا۔ ایسا معاشرہ جو عمرانی عدل (Social Justice) کے تقاضوں کو پورا کر سکے اور جس میں اسلام کا قانون ہماری و ساری ہو۔ جس میں مسلمان مغربی اقوام کی غلامی اور ان کی تعالیٰ کی بھائے اسلام کو بطور دین ہدایت اور مستقل کلچر کی حیثیت سے پیش کریں، یہ تھا بانیان پاکستان کا تصور — وہ لوگ کہ جو اس سے ہٹ کر چل رہے تھے ان کے اوپر علامہ اقبال اور قائد اعظم نے گرفت کی اور خصوصیت سے ترکی پر، جو اپنے آپ کو یورپ کے سانچے میں ڈھالنے میں مصروف تھا۔

بالکل یہی وہ تصور ہے جس کو جماعت اسلامی نے پیش کیا ہے۔ جسے آج یہ لوگ "اسلامی بنیاد پرست" کہہ رہے ہیں۔ ہم دراصل قرآن و سنت رسول ﷺ سے ماخوذ اور اسلام کے تابع فکر اقبال اور قائد اعظم کے تصور کو حقیقت کے روپ میں ڈھالنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس اعتبار سے ہمارے اور بانیان پاکستان کے تصور میں کوئی فرق نہیں۔ بانیان پاکستان کے تصور سے وہ لوگ ہٹے ہیں، جنہوں نے اس ملک میں بے دینی، مادیت، مغرب پرستی اور اباحت کو رواج دیا، یا سوشلزم کی راہ جموں کی یا اس کے حاشیہ بردار بنے۔ جنہوں نے سرمایہ داری کو یہاں پر فروغ دیا، اور جنہوں نے جاگیر داری کے ناسور کو بڑھنے اور پھیلنے کے مواقع دیے۔ جو یہاں اسلامی قانون سے انحراف کے راستے تلاش کر رہے ہیں۔ جنہوں نے یہاں علاقائی اور لسانی عصبیتیں پیدا کیں۔ ہم تو ان تمام کا مقابلہ اللہ تعالیٰ پر ایمان، دلیل اور یقین محکم سے کر رہے ہیں۔ ہم دی لڑائی لڑ رہے ہیں جو علامہ اقبال اور قائد اعظم نے لڑی تھی۔ یوں ہمارے اور بانیان پاکستان کے درمیان کوئی فکری یا عملی تضاد اور تضاد نہیں۔

سوال: جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ اقبال اور قائد اعظم تھیا کریسی کے مخالف تھے، مگر کہا جاتا ہے کہ آپ لوگ تو کہہ رہے ہیں کہ تھیا کریسی کی طرف لے جانا چاہیے ہیں؟

جواب: یہ امر واقعہ بھی ہے، اور اسی حقیقت کا اظہار علامہ محمد اقبال اور قائد اعظم محمد علی جناح دونوں نے کھل کر کیا ہے کہ اسلام تھیا کریسی نہیں ہے۔ کچھ لوگ ان بیانات کا سارا لے کر یہ بات کہنے کی کوشش کرتے ہیں کہ گویا کہ ہمارے اور ان کے موقف کے اندر فرق ہے۔ حالانکہ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ علامہ اقبال نے اس موضوع پر جہاں بحث کی ہے، وہ "خطبات" کا چھٹا خطبہ ہے۔ اس خطبے میں انہوں نے یہ بات اس معنی میں فرمائی ہے کہ "گویا بہ حیثیت ایک اصول، عملی توحید اساس ہے: حریت، مساوات اور حفظ نوع انسانی کی۔ اب اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو آرزوئے اسلام ریاست کا مطلب ہماری یہ کوشش ہو گا کہ یہ عظیم اور مثالی اصول زمان و مکان کی دنیا میں ایک قوت بن کر ظاہر ہوں۔ گویا ایک آرزو ہے ان اصولوں کو ایک مخصوص جمعیت بشری میں مشہود رکھنے کی۔ لہذا اسلامی ریاست کو حکومت النبی سے تعبیر کیا جاتا ہے تو انہی معنوں میں، ان معنوں میں نہیں کہ ہم اس کی زمام اقتدار کسی ایسے سلطان ظل الہی کے ہاتھ میں دے دیں، جو اپنی مفروضہ معصومیت کے عذر میں اپنے جو رو استبداد پر ہمیشہ ایک پردہ سا ڈال رکھے"۔ یعنی اسلام میں تھیا کریسی ان معنوں میں قطعی طور پر نہیں ہے کہ مذہب میں کوئی طبقہ اجارہ دار ہو اور بس وہی طبقہ اللہ کی مرضی کو جاننے کا واحد ذریعہ ہو۔ اسلامی تعلیمات اور اسلامی مزاج کی روشنی میں یہ فکر تھی علامہ اقبال کی۔

قائد اعظم نے یہ بات کہی ہے کہ تھیا کریسی کا میں مخالف ہوں، اس لیے کہ اسلام میں کسی ایسے طبقے کا تصور نہیں ہے کہ جو دین کا اجارہ دار ہو۔ جیسا کہ بدھ مذہب، عیسائیت، ہندومت میں اور یہودیت میں پایا جاتا ہے۔ یہ بات اسی معنی میں سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جماعت اسلامی نے ہمیشہ اسی لہجے میں کہی ہے کہ "ہم تھیا کریسی کے مخالف ہیں۔ تھیا کریسی کا کوئی تعلق اسلامی نظام سے نہیں ہے"۔ اس ضمن میں مولانا مودودی کے موقف کو جاننے کے لیے ان کی کتب سے اس بات کی تائید ہوگی۔ اب اگر کوئی پڑھا لکھا آدمی پڑھے بغیر محض مغرب کے عطا کردہ الزام، اور اہتمام کو عین علم قرار دینا چاہتا ہے تو یہ اس کی جہالت اور تنگ نظری کا

2. Dr. Mahammad Iqbal: The essence of Tauhid, as a working idea, is equality, solidarity and freedom. The state, from the Islamic standpoint, is an endeavour to transform the ideal principles into spacetime forces, an aspiration to realize them in a definite human organization. It is in this sense alone that the state in Islam is a theocracy, not in the sense that it is headed by a representative of God on earth, who can always screen his despotic will behind his supposed infallibility. "Reconstruction of Religious Thought in Islam". [ed: Saeed Sheikh] 1986, pp.122-123



تھی کہ جس نے اسے بند کر دیا ہو۔ اس لیے نظری اعتبار سے اس معاملے میں سرے سے کوئی اختلاف نہیں۔ اجتہاد کا دروازہ کھلا تھا، کھلا ہے، اور کھلا رہے گا۔

علماء متقدمین نے اجتہاد کا لفظ تین معنی میں استعمال کیا ہے۔ ایک اجتہاد ہے، اجتہاد فی المسئله۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جس حکم کی تطبیق آپ کر رہے ہیں اور اس تطبیق میں جو مسئلہ آپ کو معلوم ہے اس سے متعلق اور جو نامعلوم ہے اس کے بارے میں روشنی یا رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ اس عمل کا دروازہ بھی کبھی بند نہیں ہوا۔ امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام ابن تیمیہؒ، امام شافعیؒ وغیرہ، انہوں نے اس ذیل میں جو رہنما اصول مرتب کر دیے ہیں، ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ معنی ہمیں رواۃِ حق کے اندر ملتے ہیں، لیکن اصولاً ہماری نگاہ میں ہر قسم کے اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے، ہر طریقہ اس کی اہلیت و صلاحیت موجود ہو اور اس معاملے میں اجتہاد کی ضرورت بھی ہو۔

یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اجتہاد بلا ضرورت نہیں ہوا کرتا۔ اجتہاد کے معنی یہ نہیں کہ آپ کو ایک جھگڑا کاٹنا ہے۔ اجتہاد کے معنی صرف یہ ہیں کہ ہر صحت کی منشا کو جاننے کے لیے اگر احکام واضح اور نصوص متعین ہیں تو انہیں قبول کریں گے اور اگر کسی معاملے میں احکام واضح نہیں ہیں یا نصوص موجود نہیں ہیں تو پھر دلائل کا استعمال کریں گے۔ لیکن دلائل استعمال کرتے وقت لازماً کچھ ضابطے اور کچھ طریقے اختیار کیے جائیں گے۔ گویا ضرورت کے معاملے میں ہمارے اور اقبال کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہم اس میں یقین رکھتے ہیں کہ جہاں ضرورت ہے، وہاں ضرور اجتہاد ہونا چاہیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اجتہاد کے کچھ آداب ہیں اور اس کے لیے کچھ صلاحیت مطلوب ہے۔ اجتہاد کرنے کے لیے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ افراد جنہیں دین کی ایجاد ہونا کا بھی علم نہیں یا اسی طرح ان کے برعکس جو دور حاضر کے معاملات کے بارے میں بھی کوئی علم نہیں رکھتے، ان کو یہ حق دے دیں کہ وہ جس معاملے میں چاہیں رائے قائم کر لیں۔ اگر آپ ایک عدالت میں کیس پیش کرنے کے لیے شرط لگاتے ہیں کہ وہ شخص پیش ہو سکتا ہے جو وکیل ہو، جس نے قانون پڑھا اور قانون پڑھنے کے بعد جس نے اپنے آپ کو رجسٹرڈ کرایا ہو۔ اگر آپ ایک حکیم اور ایک ڈاکٹر کے لیے ایک طبی سطح متعین کرتے ہیں اور عطائیل کو صحت و معاشرے کے لیے ناسور تصور کرتے ہیں، اسی طرح ایک انجینئر کے لیے ایک علمی و عملی مقام ضروری سمجھتے ہیں۔ تو کیا ان کے برعکس کیا دین ہی صرف ایک ایسی چیز رہ گئی ہے کہ اس میں جو چاہے علم و عمل کے

تھی کہ جس نے اسے بند کر دیا ہو۔ اس لیے نظری اعتبار سے اس معاملے میں سرے سے کوئی اختلاف نہیں۔ اجتہاد کا دروازہ کھلا تھا، کھلا ہے، اور کھلا رہے گا۔

علماء متقدمین نے اجتہاد کا لفظ تین معنی میں استعمال کیا ہے۔ ایک اجتہاد ہے، اجتہاد فی المسئله۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ جس حکم کی تطبیق آپ کر رہے ہیں اور اس تطبیق میں جو مسئلہ آپ کو معلوم ہے اس سے متعلق اور جو نامعلوم ہے اس کے بارے میں روشنی یا رہنمائی حاصل کرنے کی کوشش کرنا۔ اس عمل کا دروازہ بھی کبھی بند نہیں ہوا۔ امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ، امام ابن تیمیہؒ، امام شافعیؒ وغیرہ، انہوں نے اس ذیل میں جو رہنما اصول مرتب کر دیے ہیں، ان میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ معنی ہمیں رواۃِ حق کے اندر ملتے ہیں، لیکن اصولاً ہماری نگاہ میں ہر قسم کے اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے، ہر طریقہ اس کی اہلیت و صلاحیت موجود ہو اور اس معاملے میں اجتہاد کی ضرورت بھی ہو۔

یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ اجتہاد بلا ضرورت نہیں ہوا کرتا۔ اجتہاد کے معنی یہ نہیں کہ آپ کو ایک جھگڑا کاٹنا ہے۔ اجتہاد کے معنی صرف یہ ہیں کہ ہر صحت کی منشا کو جاننے کے لیے اگر احکام واضح اور نصوص متعین ہیں تو انہیں قبول کریں گے اور اگر کسی معاملے میں احکام واضح نہیں ہیں یا نصوص موجود نہیں ہیں تو پھر دلائل کا استعمال کریں گے۔ لیکن دلائل استعمال کرتے وقت لازماً کچھ ضابطے اور کچھ طریقے اختیار کیے جائیں گے۔ گویا ضرورت کے معاملے میں ہمارے اور اقبال کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہم اس میں یقین رکھتے ہیں کہ جہاں ضرورت ہے، وہاں ضرور اجتہاد ہونا چاہیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اجتہاد کے کچھ آداب ہیں اور اس کے لیے کچھ صلاحیت مطلوب ہے۔ اجتہاد کرنے کے لیے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ افراد جنہیں دین کی ایجاد ہونا کا بھی علم نہیں یا اسی طرح ان کے برعکس جو دور حاضر کے معاملات کے بارے میں بھی کوئی علم نہیں رکھتے، ان کو یہ حق دے دیں کہ وہ جس معاملے میں چاہیں رائے قائم کر لیں۔ اگر آپ ایک عدالت میں کیس پیش کرنے کے لیے شرط لگاتے ہیں کہ وہ شخص پیش ہو سکتا ہے جو وکیل ہو، جس نے قانون پڑھا اور قانون پڑھنے کے بعد جس نے اپنے آپ کو رجسٹرڈ کرایا ہو۔ اگر آپ ایک حکیم اور ایک ڈاکٹر کے لیے ایک طبی سطح متعین کرتے ہیں اور عطائیل کو صحت و معاشرے کے لیے ناسور تصور کرتے ہیں، اسی طرح ایک انجینئر کے لیے ایک علمی و عملی مقام ضروری سمجھتے ہیں۔ تو کیا ان کے برعکس کیا دین ہی صرف ایک ایسی چیز رہ گئی ہے کہ اس میں جو چاہے علم و عمل کے

بغیر اجتہاد کی طبع آزمائی کے لیے خم ٹھونک کر میدان میں آجائے۔ عہد حاضر میں بھی اجتہاد کے لیے: قرآن و سنت کا وسیع فہم، عربی زبان و ادب کا ذوق، فقہی سرمائے سے گہری شناسائی، تقویٰ اور جدید معاشی و سیاسی فلسفے کے وسیع مطالعے کی ضرورت ہے۔ علامہ اقبال جیسے بلند پایہ قانون دان ایسے کسی غیر منصفانہ نقطہ نظر کے قائل نہیں تھے، کہ جس میں ان بنیادی تقاضوں کو نظر انداز کیا جائے۔

علامہ اقبال نے خود اسی خطبے میں یہ بات کہی، کہ جہاں اجتہاد ضروری ہے وہاں اجتہاد کے لیے احتیاط، روایت کا احترام اور اجتہاد کرنے والوں میں علم، صلاحیت، خدا خوفی اور تقویٰ بھی ضروری ہے۔ علامہ محمد اقبال نے اپنی اجتہادی رائے کے مطابق نئے دور میں بلاشبہ نیشنل اسمبلی کو اس بات کا حق دینے کی تائید کی ہے کہ دور حاضر میں وہ اجتہاد کی ذمہ داری ادا کر سکتی ہے۔ انہوں نے یہ بات خاص طور پر مصطفیٰ کمال پاشا کے ترکی میں تجربے کی روشنی میں کہی تھی۔ اس حوالے سے یہ بات بھی سامنے رہے کہ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۲۸ء تک، کمال ازم نے اپنا لدنی چہرہ چھپایا ہوا تھا اور یہ اسی زمانے کی بات ہے۔ لیکن جب مصطفیٰ کمال پاشا کا اصل سیکور چہرہ روز روشن میں سامنے آگیا اور اس نے لادینیت اور خالص سیکور ازم کی بات کی تو علامہ اقبال تڑپ اٹھے۔ پھر انہوں نے واضح طور پر اس سے اپنی برأت کا اظہار کیا اور کہا:

نہ مصطفیٰ، نہ رضا شاہ میں نمود اس کی

کہ روح شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی

پھر علامہ اقبال نے مصطفیٰ کمال پاشا کو مخاطب کر کے ہی یہ فرمایا تھا:

لدنی و لاطینی، کس بیچ میں الجھا تو

دارو ہے ضعیفوں کا، لاغالب الہو

اور علامہ محمد اقبال نے ملت اسلامیہ کی قیادت کے ذہنی افلاس اور عملی انحراف کا نوحہ کچھ اس طرح کیا:

کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی قیادت

وہ کمند دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

جس پس منظر میں علامہ اقبال نے یہ بات کہی ہے کہ اسمبلی کو اجتہاد کا یہ اختیار دیا جاسکتا ہے، اسی لیکچر میں علامہ اقبال جہاں قانون ساز اسمبلیوں کے کردار پر زور دیتے ہیں، وہاں پر وہ

صاف صاف یہ بھی کہتے ہیں کہ "مہالس قانون ساز میں علماء کو بطور ایک موثر جزو شامل کر لیں، لیکن علماء بھی ہر امر قانونی میں آزادانہ بحث و تمحیص اور اظہار رائے کی اجازت دیتے ہوئے اس کی رہنمائی کریں۔ بایں ہمہ اسلامی حریمت کی غلط تعبیرات کا سد باب ہو سکتا ہے، تو صرف اس طرح کہ موجودہ حالت میں مسلم ممالک میں فقہ کی تعلیم جس منہج پر ہو رہی ہے، اس کی اصلاح کی جائے۔ فقہ کا نصاب مزید توسیع کا محتاج ہے، لہذا ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے ساتھ ساتھ جدید فقہ کا مطالعہ بھی پوری احتیاط اور سوچ سمجھ کر کیا جائے۔"

اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے پھر علامہ اقبال نے ۱۹۳۲ء میں فرمایا تھا "سیری تجویز یہ ہے کہ علماء کی اسمبلی تشکیل دی جائے، جس میں وہ مسلمان قانون دان شامل کیے جائیں جنہوں نے جدید اصول قانون کی تعلیم حاصل کی ہے، تاکہ جدید حالات کی روشنی میں اسلامی قانون کا تحفظ کیا جائے اور اسے وسعت دی جائے۔ اس اسمبلی کو تسلیم کیا جائے تاکہ مسلمانوں کے شخصی قانون کو تیار کرنے والا کوئی بل اس اسمبلی کی کھالی سے گزرنے سے پہلے قانون سازی کے لیے نہ رکھا جائے۔"

علامہ اقبال نے یہ نہیں بھماکہ منتخب اسمبلیوں کو سیاہ کو سفید اور سفید کو سیاہ بنانے کی کھلم کھلا آزادی دے دو۔ انھوں نے بھما ہے کہ بلاشبہ اسمبلی کو یہ اختیار دیا جاسکتا ہے لیکن اس اسمبلی میں اس صلاحیت کے لوگ ہونے چاہیں کہ وہ حریمت کو سمجھ سکیں اور ہم بھی یہی بات کہتے ہیں کہ آج کے دور میں اسمبلی، عدالت اور علماء ان سب کو اجتہاد کے عمل میں آنا چاہیے۔ لیکن یہ کام علم کے ساتھ ہی کرنے کی اجازت ہوگی، علم کے بغیر نہیں۔ اس پہلو سے ہمارا اور علامہ اقبال کا موقف ایک ہے۔

حالان کم لظ کو اجتہاد کا حق دینے کے لیے اقبال تیار نہیں اور اگر حالان کم لظ، اقبال کا سارا لے کر اجتہاد کا حق حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انہیں یہ حق نہ اسلام دیتا ہے اور نہ اسلام کا بسا ہی اقبال ان کو یہ حق دیتا ہے اور نہ ہم ان کو یہ حق دیتے ہیں۔ اگر اسی منہج سے سوچ کو یہ عناصر تیار کریں گے تو پھر ہمیں یہ الزام قبول ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ تیار کریں گے کیونکہ یہاں ہر صاحب تقویٰ اور صاحب علم شخص کے لیے راستہ کھلا ہوا ہے۔ اس ذیل میں کسی کی اجارہ داری نہیں، وہ جدید تعلیمی اداروں سے آئیں، یا قدیم تعلیمی

۵۔ راجتھاد عالمان کم لظ۔ اقتداء بر مشائخ محفوظ تر (اقبال) ۲۷۱ ص ۲۷۱

اداروں سے آئیں، وہ جبہ و دستار میں ملبوس ہوں یا کوٹ، پتلون زب تن کیے ہوئے ہوں، وہ مغرب کے ڈگری یافتہ ہوں یا مشرق کے تعلیم یافتہ، اگر ان کے پاس علم ہے، ان کے پاس تقویٰ ہے تو انہیں بجا طور پر یہ حق ہے کہ وہ اپنی رائے دیں۔ اس کے بعد دیکھیں کہ امت کا اجتماعی ضمیر ان اصحاب حل و عقد کی رائے کو کس انداز سے قبول کرتا ہے۔ گویا ہمارے اور علامہ اقبال کے تصور اجتہاد میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہم نے اس پر شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے اور اقبال کے تمام شرعی اور شرعی ماخذ و مصادر کو کھنگال کر دکھلایا ہے کہ اقبال کا تصور اجتہاد کس طرح تشکیل پاتا ہے۔<sup>۶</sup>

علامہ اقبال اس ضمن میں کھلی آزادی اور مغرب کی اندھی تقلید کو روا نہیں رکھتے، بلکہ وہ ان احتیاطوں کے ساتھ جو اسلام متعین کرتا ہے، بالکل انہی کے ساتھ ہی فکر نو کے تقاضوں کو پورا کرنا چاہتے ہیں اور ہماری بھی یہی خواہش اور کوشش ہے۔ پروفیسر محمد منور مرزا صاحب نے اجتہاد سے متعلق اقبال کے اقوال کے بارے میں بجا طور پر کہا ہے کہ "حضرت علامہ کا تصور اجتہاد خود اجتہاد ہی کی طرح ارتقاء پسند اور ارتقاء پذیر رہا، لہذا ہمیں "تشکیل جدید" (یعنی "خطبات") کی روشنی میں اور مابعد کے مکتوبات، بیانات، خطبات اور تصریحات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ علامہ اقبال کی سوچ ۱۹۲۹ء تک پہنچ کر رک نہ گئی تھی۔" یہ بات اقبال اور فکر اقبال کی منفعتانہ توضیح ہے۔

کیا قائد اعظم سیکولر پاکستان کے داعی تھے؟

سوال: کیا قائد اعظم نے ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کو اپنی مشہور تقریر میں آپ لوگوں کے تصور اسلامی ریاست کی مخالفت نہیں کر دی تھی؟  
جواب: سب سے پہلے تو اپنے سوال کی اس مغالطہ انگیزی کو درست کر لیجیے کہ اسلامی ریاست کا تصور کوئی ہمارا وضع کردہ نہیں، بلکہ ہم نے ریاست، حکومت اور سیاست کے جن اصولوں کی طرف امت مسلمہ اور پھر دنیا بھر کو دعوت دی ہے، وہ قرآن و سنت رسول ﷺ، خلافت راشدہ اور مجموعی اسلامی فکر سے ماخوذ ہے۔ ہمیں بس یہ سعادت نصیب ہوئی ہے کہ اس فکر

۶۔ ملاحظہ ہو ہمارے مضمون "اقبال اور اسلامی قانون کی تشکیل جدید" مطبوعہ "چراغ راہ" اسلامی قانون نمبر اور انگریزی مضمون Iqbal and Reconstruction of Islamic Law مطبوعہ مہلہ "اقبال ریویو"۔ اپریل ۱۹۶۰ء۔ اور "خطبات اقبال پر ایک نظر" از محمد سعید اکبر آبادی، اقبال اکادمی پاکستان لاہور، ۱۹۸۷ء

پر حکمرانوں کی ملوکیت اور آمریت نے جو آہنی پردہ ڈال رکھا تھا، ہم نے اسے ہٹایا ہے۔ اس سوچ کو علماء و فضلاء کی جس اکثریت نے بے علمی اور فرقہ واریت کی سمیٹ چڑھا دیا تھا، اسے بچانے کے لیے ہم کمر بستہ ہوئے۔ اس تہذیب کو مغربی سامراج اور اس کے دیسی حواریوں نے جس فدیہ نامہ اور محکومانہ درس کا خوگر بنا رکھا تھا، ہم نے اس سے بغاوت کی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ قائد اعظم کی ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء کی تقریر کو سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کیا جاتا ہے۔ یہ تقریر قائد اعظم نے بہت ہی مخصوص حالات میں کی تھی۔ پوزیشن یہ تھی کہ پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس تھا، جس میں قائد اعظم کو صدر منتخب کیا گیا اور اس انتخاب پر اظہارِ تشکر کرتے ہوئے قائد اعظم نے یہ تقریر کی تھی۔

انہوں نے اپنے دل کے پھچھوٹے کھول کر قوم کے سامنے رکھے کہ آج بر عظیم میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی ہے، انسان، انسان کو قتل کر رہا ہے، خون بہایا جا رہا ہے، حقوق پامال ہو رہے ہیں اور یہ وہ پس منظر ہے جس میں انہوں نے یہ بات کہی کہ ہم جو ریاست حاصل کر رہے ہیں، اس میں کسی کا کوئی بھی مذہب ہو، خواہ وہ اسلام ہو، خواہ وہ ہندو مذہب ہو، ان سب کو برابر کے حقوق حاصل ہوں گے۔ اس تقریر میں مسکد ریاست کی نوعیت کا نہیں، بلکہ مسکد شریوں کے حقوق اور جان اور مال کے تحفظ کا ہے۔ شریعت اور جان و مال کے تحفظ کے باب میں اسلام مسلمانوں اور غیر مسلموں کو برابر کا تحفظ اور برابر کے حقوق دیتا ہے۔ یہ روایت سیکولرازم کی نہیں، بلکہ اسلام کی ہے۔ اسی طرح قائد اعظم کے الفاظ Business of the State کو بہت ایکسپلائٹ کیا جاتا ہے۔ یہاں بھی علمی خیانت کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔ کیونکہ بزنس آف دی اسٹیٹ کا مقصود مطلوب Nature of the State نہیں ہوتا۔ بزنس آف دی اسٹیٹ کے معنی صرف استقام و انصرام سے متعلق ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی کوئی اور تعبیر نہیں کی جاسکتی۔

کچھ لوگ اس تقریر کو سیکولرازم کے جواز کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ ان سے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قائد اعظم نے اس تقریر سے پہلے اور اس تقریر کے بعد بھی پاکستان کے اسلامی تشخص اپنانے، اسلامی قانون کو بنیاد بنانے، قرآن و سنت کی روشنی میں یہاں کے نظام کو ترتیب دینے اور اسلامی عدل اجتماعی کی بنیاد پر معاشرے کو استوار کرنے کی ضرورت و اہمیت کو تسلسل کے ساتھ بلا القطار بیان فرمایا ہے۔ انہوں نے جو تقریر اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے افتتاح کے موقع پر جولائی ۱۹۴۸ء میں فرمائی ہے، اس میں بھی اور اس سال عید کے پیغام میں بھی انہوں نے کہا ہے کہ ”ہم ملک میں اسلامی قانون نافذ کرنا چاہتے ہیں“ — سوال یہ ہے کہ



قائد اعظم کی محض ۱۱ اگست والی تقریر ان کے باقی تمام اقوال سے ہٹ کر رہ گئی ہے اور وہ ان کی پہلے اور بعد والی تمام تقاریر و بیانات کو منسوخ کر دینے والی تقریر ہے؟ محض یہی ایک الہامی تقریر ہے اور ان کی باقی تمام بے وقعت تقاریر ہیں۔ کسی شخص کے فکر اور تصور کو سمجھنے کے لیے کیا کسی ایک چیز کو اس کے سیاق و سباق سے نکال کر کے دیکھا جاتا ہے یا فیصلہ کرنے کے لیے اس کی ساری چیزوں کو سامنے رکھا جاتا ہے؟ اور اگر ساری چیزوں کو سامنے رکھا جاتا ہے تو قائد اعظم کا تصور اسلامی ریاست بھی بالکل واضح ہے۔

پھر کیا ان لوگوں کی نگاہ میں قائد اعظم اتنے بے اصول انسان تھے کہ قوم سے وعدہ تو انہوں نے اس بات کا کیا، کہ میں تمہیں پاکستان کی جدوجہد میں شرکت کی اس لیے دعوت دے رہا ہوں تاکہ تم ایک نظریاتی قوم کی حیثیت سے، اسلامی نظام اور اسلامی قوانین کی علم بردار قوم کی حیثیت سے جدوجہد کرو اور ابھی آزادی ملنے میں تین دن باقی ہیں، لیکن وہ اپنے سارے کبے دھرے کے اوپر پانی پھیر دیں، اس سے یک دم چمکے ہٹنے کا اعلان کر دیں اور یہ کہہ دیں کہ میں تو ایک لادینی اور سیکولر اسٹیٹ کے لیے کام کرتا رہا ہوں۔ پھر اس کے بعد دوبارہ ایسی تضاد بیانی کا شکار ہوں کہ ستمبر ۱۹۴۷ء سے لے کر جولائی ۱۹۴۸ء تک جتنی تقاریر کریں، ان میں پھر وہ اسلام کی باتیں تکرار سے کرتے لگ جائیں۔

لیکن معاف کیجیے قائد اعظم نہ تضاد بیانی کے قائل تھے۔ اسی طرح نہ بے اصول تھے، نہ قائد اعظم پر کسی قسم کی ٹولیدہ فکری کا الزام لگایا جاسکتا ہے اور نہ ان پر لفاظی کی تہمت لگائی جاسکتی ہے۔ وہ ہمیشہ جرأت کے ساتھ اپنے موقف پر قائم رہے، جس بات کو درست سمجھا ہے اس کو برملا کہا ہے انہوں نے متضاد باتیں نہیں کی ہیں۔ قائد اعظم کی اس تقریر کو ان کی باقی تقاریر کے پس منظر میں دیکھنا ہو گا اور اسی کے مطابق تطبیق اور اس کی تعبیر کرنا ہو گی۔ ان کی یہ بات بالکل درست ہے کہ اسلام میں تھپا کر یہی نہیں ہے اور اسلام میں شہریت کے حقوق برابر ہیں۔ یہ بات اسلام کے مطابق ہے، جس میں مسلمان، غیر مسلم سب شہری یکساں حقوق کے مالک ہیں۔ بشرطیکہ وہ اپنی شہریت کے تقاضے پورے کریں۔ اس کے ساتھ اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ پاکستان ایک سیکولر اسٹیٹ ہو گا یا پاکستان ایک ایسی اسٹیٹ ہو گا جس کا مذہب اور دین سے کوئی تعلق نہ ہو یا اسلامی قوانین جاری نہ ہوں، — ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اس تقریر کی غلط تعبیر ہو گی۔

قائد اعظم پر میری نگاہ میں یہ ایک الزام اور ہستان ہے۔ ان تمام الزاموں سے بڑا الزام اور

ہستان ہے، جو قائد اعظم کے بڑے سے بڑے ناقد اور مخالف بھی ان پر لگانے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن وہ لوگ جو قائد اعظم کی فکر کے علم بردار بنتے ہیں، وہی دراصل قائد اعظم کے کردار کو گھمنانے کے لیے یہ کام کر رہے ہیں اور ہم اس کے مقابلے میں قائد اعظم کے خیالات کی جو تصویر کر رہے ہیں، وہی ہے جو ان کے پورے کریکٹر سے، ان کے تمام ارشادات سے ہم آہنگ ہے اور جس میں بظاہر پر قائد اعظم کی ایک دیانت دارانہ، منصفانہ اور خود ان کی اسگوں کی ترجمان تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔

## عورت کی سربراہی اور اسلامی تحریکیں

سوال: یہ احساس بڑی شدت سے پایا جاتا ہے کہ جماعت اسلامی اور اسی نوعیت کے دوسرے "بنیاد پرست" حضرات کا رویہ جدید صنعتی دور میں عورت کی فطری ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے۔ بنیاد پرستی سے منسوب آپ رہنماؤں کا مجموعی رویہ عورت کا دل جیتنے کے بجائے ایک جدید تعلیم یافتہ عورت کے دل و دماغ میں اسلام کے بارے میں وسوسے پیدا کرتا ہے۔ جب اسلام دین فطرت ہے تو پھر کیا یہ خواتین کو مناسب اور برابری کے حقوق عطا نہیں کرتا؟

جواب: بلاشبہ اسلام دین فطرت ہے اور اسلام عورت کو نہ صرف مناسب حقوق دیتا ہے، بلکہ صحیح معنوں میں برابری کے حقوق بھی دیتا ہے۔ اسلامی تحریکوں کے قائدین ہی کا نہیں، بلکہ اس معاملے میں بھی علامہ اقبال ہی کا مطالعہ کر لیا جائے اور خصوصیت سے "زموزبے خودی" کو کھلی آنکھوں سے پڑھا جائے، جس میں انہوں نے مغرب کے عورت سے متعلق رویوں کا جو تجزیہ کیا ہے، اسے ذہن میں رکھا جائے، تو "عورت اور اسلام" کے بارے میں مغرب کی تشکیل شدہ ابلاغی جارحیت کا جواب مل جاتا ہے۔

اسلام اور ایک مسلم معاشرے میں عورت کا یہ مقام ہے، کہ وہ ایک ماں، ایک بہن، ایک بیوی، ایک بیٹی کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کرتی ہے۔ مسلم معاشرے میں عورت کو عورت سمجھ کر اور عورت رکھ کر ہی ترقی کا راستہ دکھایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس مغرب نے جو ترقی کا راستہ لکالا ہے اس میں عورت، عورت نہیں رہتی۔ ہمارے نزدیک عورت کے ساتھ تاریخ میں ظلم تو ہمیشہ ہوا ہے، ماضی میں عورت کو عورت رکھتے ہوئے اس پر ظلم کیا گیا، اسے پست کیا گیا، اسے



پابند بنایا گیا، اسے غلام رکھا گیا اور اسے ہوس کا نشانہ بنایا گیا۔ لیکن آج کے مغرب نے "ترقی اور برابری" کے خوش نما نعروں کے فریب میں عورت پر جو ظلم کیا ہے، اس نے عورت کو اس کی انسانیت سے محروم کر دیا ہے، اسے He - Woman بنانے کی کوشش کی ہے اور یہ سب بڑا المیہ عورت کے "حقوق" کے نام پر ہوا ہے۔

یہ درحقیقت "انقلاب" کے نام پر سرمایہ داروں اور مابوکاروں کی ایک سازش تھی، جنہوں نے سستی مزدوری کی خاطر عورت کو گھر سے نکالا اور اس کے نتیجے کے طور پر صرف عورت ہی کے لیے نہیں، بلکہ پورے صنعتی طبقے کے لیے غیر متناسب معاوضے رکھے۔ آج بھی ڈیڑھ دو سو سال کی نام نہاد ترقی، اور نسوانی حقوق اور مساوات کے اعلانات کے باوجود مردوں اور عورتوں کے معاوضوں میں امتیازی سلوک کیا جا رہا ہے۔ دراصل یہ عورت کی ترقی نہیں، بلکہ یہ عورت کا استحصال ہے۔ اس کے مقابلے میں ہم اسلامی تعلیمات کی روشنی میں عورت کو عورت رکھتے ہوئے، عورت کو ترقی کے تمام مواقع دیتے ہیں اور یہی اسلام کی بنیادی شان اور امتیازی آہن ہے۔

قرآن نے جس چیز کو سب سے زیادہ اہمیت دی ہے، وہ یہ ہے کہ بحیثیت انسان، عورت اور مرد بالکل برابر ہیں۔ ان کے لیے ایمان لانے کا معیار ایک ہے، آخرت میں جواب دہی کا پیمانہ ایک ہے اور آخرت میں کامیابی اور ناکامی کی میزان بھی ایک ہے۔ آپ قرآن کا حسن بیان دیکھیں کہ اس نے مومنین، مومنات، صادقین، صادقات، محسنین، محسنات، یعنی ہر جگہ دونوں کو برابر رکھ کر کلام کیا ہے۔ اس کے بعد اسلام نے ہر ایک سے اس کی ضرورت، اس کی فطرت، اس کے سماجی کردار کے مطابق کام لیا ہے اور ترقی کے مواقع دیے ہیں۔ یہی ہمارا تصور ہے اور یہ تصور نہ تو ترقی کی راہ میں حائل ہے اور نہ کسی دوسرے پہلو سے عورت کے لیے ضرر اور استحصال کا سبب بنتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ صرف دو تہذیبوں کا فرق دیکھیے۔ ایک مغربی کلچر ہے، جس نے صنعتی انقلاب میں عورت کو بطور مزدور استعمال کیا اور گھر کو تباہ کر کے یہ ہدف حاصل کیا۔ اس کے برعکس جاپان نے ہر چند کہ وہ کوئی اسلامی ملک نہیں تھا، اس نے بھی صنعتی ترقی کی، عورت کی لیبر کو استعمال کیا، لیکن گھر کے ادارے کو تباہ کیے بغیر۔ معلوم ہوا کہ صنعتی ترقی کے تقاضے پورے کرنے کے بہت سے راستے ہیں، کوئی ایک راستہ ہی نہیں۔ ہم وہ راستہ اختیار کریں گے، جو ہمارے کلچر، ہماری اقدار اور ہماری قومی منزل سے مناسبت رکھتا ہے۔ آپ کے سوال میں ایک لفظ "برابری" (Equality) بھی قابلِ غور ہے۔ اس لفظ کو

بھی بڑا کنفیوز کیا گیا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ "مغرب کا تصور مساوات مرد و زن برابری کو معیاری اور مطلوب سطح پر لاتا ہے، اور اسلام جس میں حقیقت اور ضرورت کی مناسبت سے مختلف جگہ پر مختلف فرق کیے گئے ہیں، وہ برابری کے معنی میں نہیں ہیں"۔ — میرے نزدیک یہ "مغرب کے ملاؤں" یا ان کی حال چلنے والے مشرق کے "مغرب زدہ ملاؤں" کا بے معنی الزام ہے۔ تنوع اور فطرت حقیقت ہے۔ اس تنوع اور اس فطرت کو ختم کرنا ہی دراصل جبر و استبداد ہے۔ یہ جبر برابری کے نام پر کیا جائے یا کسی اور نام پر کیا جائے۔ اسلام اس میں جہاں جہاں فرق رکھتا ہے، ہم اس فرق کو قبول کرتے ہیں۔ لیکن اسلام کا پیش کردہ تصور عدل و انصاف اور معروضی حقائق پر مبنی ہے۔ اس کی وجہ سے عورت اور مرد کی حیثیت میں فرق نہیں پڑتا۔ اس کے بنیادی مقام و مرتبے اور ذمہ داری یا جواب دہی میں فرق نہیں آتا۔ مثال کے طور پر اگر شہادت کے قانون میں ایک جگہ اسلام نے یہ ضابطہ بنایا ہے کہ یہاں صرف عورت کی شہادت قبول ہو گی، مثلاً زچگی، رضاعت وغیرہ تو اس میں مرد کی شہادت قبول نہیں ہو گی۔ اور دوسری جگہ بتایا کہ یہاں مرد کی شہادت قبول ہو گی تو یہ عدم مساوات نہیں، یہ وہ انصاف پسندی ہے جو فطرت اور ضرورت نے متعین کی ہے اور اس کا تعلق حقوق سے نہیں ہے۔ اور جہاں حقوق کا معاملہ ہے وہاں اسلام نے حقیقی معنوں میں عدل قائم کیا ہے، جبکہ "مساوات" کا لفظ مغرب کا محض وہ کھوکھلا لہر ہے جو نہ تو انہماکی اشتراکیت دے سکی، اور نہ تہذیبی بیماری کا شکار امریکہ و یورپ آج تک قائم کر سکا ہے۔

سوال: اگرچہ آپ خواتین کو ووٹ کے حق سے محروم نہیں کرتے، لیکن ریاست کے اہم مناصب یعنی صدارت، وزارت عظمیٰ وغیرہ انہیں دینے سے انکار کرتے ہیں۔ ۱۹۶۳ء میں مولانا مودودی نے محترمہ فاطمہ جناح کی امیدواری صدارت میں ان کی حمایت کر کے گویا باقاعدہ اجتہاد سے کام لیا تھا، اور وہ بلاشبہ دور حاضر میں سب سے زیادہ روشی خیال بنیاد پرست تھے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ یہاں پر محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کی مخالفت کی گئی اور بنگلہ دیش جماعت اسلامی نے ۱۹۹۱ء میں وہاں پر پارلیمنٹ میں وزارت عظمیٰ کے لیے بیگم خالدہ ضیاء کی حمایت کی۔ میں یہ بات کرنا چاہتا ہوں کہ کیا آج کے احوال و ظروف کو مد نظر رکھتے ہوئے، مولانا مودودی

کے ۱۹۶۴ء کے اجتہاد کو کیوں نہ برقرار رکھا جائے؟  
جواب: شکریہ، سب سے پہلے تو مجھے یہ خوشی ہوئی کہ کم از کم بنیاد پرستوں میں آج ایک اور قسم کا اضافہ ہوا ہے اور وہ ہے "روشن خیال بنیاد پرست"۔ اس عنایت سے یہ بھی انکشاف ہوا کہ مولانا مودودی کے جو مختلف اجتہاد ہیں، ان میں کچھ روشن خیال ہیں اور کچھ اتنے زیادہ روشن خیال نہیں ہیں۔ لیکن ہر حال یہ حق میں آپ ہی کو دیتا ہوں کہ آپ یہ طے کریں کہ کیا چیز روشن خیالی ہے اور کیا چیز تاریک خیالی ہے۔ جب کہ امر واقعہ یہ ہے کہ میں نے تو مولانا مودودی کو بحیثیت مجموعی بہت زیادہ روشن خیال اور متوازن ہی پایا ہے اور مجھے ان میں معروف مصلوں میں اس نام نہاد بنیاد پرستی کی کوئی جھلک نظر نہیں آئی، جو آج مغرب کے سیاست دان اور ذرائع ابلاغ ان کے اور اسلامی تحریکوں کے سر پر تصویب رہے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ بلاشبہ اسلام عورت کو ووٹ کا حق دیتا ہے اور اسلام نے عورت کو ووٹ کا حق اس وقت دیا، جب ابھی یورپ نے ووٹ کے معنی بھی نہیں سمجھے تھے۔ آج بھی سوئٹزرلینڈ کی دو ایک ایسی ریاستیں ہیں، جہاں عورت کو ووٹ کا حق ہے اور نہ منتخب ہونے کا حق۔ افغانستان اور امریکہ کی جمہوریت میں عورت کو ووٹ کا حق پہلی جنگ عظیم کے بعد بیسیویں صدی کے تیسرے دہے (Decade) میں ملا تھا۔ ہر حال ہماری لیے وہ کوئی قابل تقلید مثال نہیں ہیں۔

اسلام نے اپنا نظام بنایا ہے اور اس نظام میں کچھ ذمہ داریاں بھی تقسیم کیں اور انہی ذمہ داریوں کی تقسیم کی مناسبت سے سوسائٹی کے مختلف طبقوں اور افراد کو اپنا کردار ادا کرنے کا موقع دیا ہے۔ اس معاملے میں اسلام نے گھر اور خاندان کو تہذیب کا گھوموارہ قرار دیا ہے۔ عورت اور مرد کے اختلاط اور مخلوط مجلسی زندگی کی اسلام نے حوصلہ شکنی کی ہے۔ اسلام نے گھر کے نظام میں عورت کو ملکیت کا حق دیا، تہارت کا حق دیا، نفع کمانے کا حق دیا ہے اور یہ حق دیا کہ اپنا نفع وہ اپنے پاس رکھے۔ لیکن خاندان اور گھر کی مالی ضروریات کو پورا کرنا شوہر کا ذمہ قرار پایا اور عورت کے اوپر یہ ذمہ داری نہیں ڈالی۔ اگر شوہر غریب بھی ہو تب بھی وہ عورت کی ذاتی دولت سے گھر کی ذمہ داری پوری کرنے کے لیے اس پر قبضہ جمائے گا حق نہیں رکھتا۔ یہ اسلام کا مزاج ہے، جس کو اس نے ہر جگہ قائم کیا۔ اسی تناظر میں معاشرے کے اجتماعی اور سیاسی معاملات میں اسلام نے عورت کو رائے کا حق بھی دیا ہے۔

اسلام نے عورت کو یہ حق بھی دیا ہے کہ اجتماعی امور میں وہ اپنی رائے دے، اس سے

مشورہ لیا جائے، وہ معاملات جن کا عورت سے براہ راست تعلق ہو اس میں ان کو فیصلے کا اختیار بھی دیا جائے اور وہ معاملات جو براہ راست ان سے متعلق نہیں ہیں، ان میں انھیں مشورے کے لیے شریک کیا جائے۔ لیکن ان کے نفاذ کا جو نظام اسلام نے بنایا ہے، اس میں ایک فوج کے سربراہ، ایک ریاست کے سربراہ وغیرہ کی ذمہ داری ہر طور پر مرد پر ہے، عورتوں پر نہیں ڈالی گئی ہے۔ یہ اسلام کی اصلی پوزیشن ہے۔ لیکن اگر کبھی غیر معمولی حالات ہوں تو اس قطعی طور پر محدود اور غیر معمولی حالت کی حد تک اس میں رعایت اور اختلاف کی گنجائش بھی موجود ہے۔

اس کی مثال بالکل اس طرح سے ہے جیسے اگر ضرورت پڑ جائے تو جان بچانے کے لیے وہ چیزیں جو عام حالات میں اسلام میں قطعی طور پر حرام ہیں، ان چیزوں کو محض اور محض ضرورت کی حد تک استعمال کرنا جائز ہو جاتا ہے۔ یہی وہ فریم ورک ہے، جس میں مولانا مودودی نے ۱۹۶۳ء میں اور صرف مولانا مودودی ہی نے نہیں بلکہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور اس ملک کے دوسرے علماء کرام نے یہ رائے دی کہ فیلڈ مارشل ایوب خان کی اہمیت کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک ایسی قانون کو جو پورے ملک و قوم کی نگاہ میں محترم و معزز ہیں، ان کے ذریعے اس اہمیت کو سرنگوں کیا جاسکتا ہے۔ یاد رہے، کہ ایوب خان نے مارشل لا کے تحت اسلام کے عائلی قوانین میں زبردستی تبدیلی کی، اہمیت کے ذریعے مشرقی پاکستان میں بددلی پیدا کی، پارلیمانی جمہوریت کے بجائے بالواسطہ انتخابات اور صدارتی نظام کو نافذ کیا گیا تھا۔ جس نے پورے ملک کا سماجی ڈھانچہ اور سیاسی وجود ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ان غیر معمولی حالات میں مولانا مودودی اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اس بات کو مناسب سمجھا کہ محترمہ فاطمہ جناح کی صدارت کی امیدواری کی تائید کریں اور میں خود بھی اس فیصلے کی تائید میں لکھنے والوں میں شریک تھا۔ غیر معمولی حالات میں شریعت اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ اجتماعی ضروریات اور اجتماعی مصلح کے تحت اس نوعیت کے فیصلے کیے جاسکتے ہیں۔ مخصوص حالات کی چیز کو عمومی درجہ دینا چیز سے دگر ہے۔

اور یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ محترمہ فاطمہ جناح نے بڑی عالی ظرفی کا ثبوت دیا۔ انہوں نے قوم سے اس بات کا وعدہ کیا کہ "میں یہ الیکشن جیتنے کے بعد پارلیمنٹری سسٹم کو بحال کر دوں گی" اور اس طرح گویا کہ انہوں نے ایک طرف ان مخصوص حالات میں صدارت کی ذمہ داری قبول

۷۔ ملاحظہ ہو میرا مضمون "جمہا نمہ" "قارآن" ۱۹۶۳ء میں بطور ادارہ یہ شائع ہوا۔

کی تھی اور دوسری طرف اسے ایک عارضی استقام تصور کیا اور یہ وعدہ کیا صدر قتی تمام سے ہٹ کر ہم پارلیمانی نظام لائیں گے اور پارلیمانی نظام جیسا کہ آپ کو معلوم ہے وہ تقسیم اختیارات کے لقمہ پر مبنی ہے۔ پھر یہ کہ مولانا مودودی نے محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کے ضمن میں اپنی رائے جن دلائل کے تحت ظاہر کی، ان میں اضطراب اور وقتی ضرورت کو بنیاد بنایا۔ محترمہ فاطمہ جناح نے بھی اپنی ایک تقریر میں اس بات کا اعتراف کیا کہ "میں جماعت اسلامی والوں کی مسنون ہوں کہ انہوں نے میری حمایت کی ہے۔ انہوں نے اس کو ایک اجتماعی ضرورت کے تحت اور ایک قابل قبول برائی کے طور پر تسلیم کیا ہے۔" اس معاملے میں ہم نے کوئی مداخلت نہیں کرتی، ضرورت سے کوئی انحراف نہیں کیا، بلکہ اس کی صحیح پوزیشن بتا کر ہی ان کی حمایت کی۔

باقی جہاں تک آپ کے سوال کے دوسرے پہلو کا تعلق ہے۔ بنگلہ دیش کے انتخابات ۱۹۹۱ء کے حوالے سے، تو اس ضمن میں چند گزارشات پر ٹھنڈے دل سے غور کیجئے۔ بنگلہ دیش، سابق مشرقی پاکستان، جہاں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا، جہاں کے مسلمانوں نے تحریک آزادی اور قیام پاکستان کی جدوجہد میں بے مثل حصہ لیا، بلکہ صوبہ سرحد اور پنجاب سے بھی زیادہ۔ اب اس خطے کو پاکستان کے داخلی تضادات کے ساتھ ساتھ ۲۴ سال بعد وہاں بسنے والے دس فیصد ہندوؤں اور کیملٹ پارٹی کے مضبوط کیدز کی مدد سے بنگلہ قوم پرست عوامی لیگ نے اس کلائمکس پر پہنچا دیا کہ بھارت اور اشتراکی روس کی مشترکہ معاونت اور مغرب کی اعانت کے ذریعے اس حصے کو پاکستان سے کاٹ دیا گیا۔ لیکن وہاں کی مسلم آبادی بھاطور پر پہلے کی طرح اب بھی ہندو ذہنیت سے خائف ہے۔ جہاں ہندو اپنے دس فیصد ووٹوں کے ذریعے متحدہ شکل میں عوامی لیگ کی پشت پر ہیں۔ اب ان عام انتخابات میں ایک جانب عوامی لیگ کی حسینہ واجد تھیں، جو نہ صرف اعلانیہ بلکہ فکری سطح پر بھی بنگلہ دیش کو بھارت کی حاشیہ بردار ریاست کا درجہ دینے کی سعی کر رہی ہیں اور پاکستان سے شدید دشمنی کے جذبات رکھتی ہیں۔ مزید یہ کہ وہ مجموعی طور پر بنگلہ قومیت کی علم بردار اور مسلم قومیت کے کسی بھی تصور کی مخالف ہیں اور پھر ایک قابل لحاظ استثنائی قوت کی مالک بھی ہیں۔

اس کے مقابلے میں بیگم خالدہ ضیاء تھیں، جو ہندو ذہنیت کی چیرہ دستیوں کی کھلم کھلا نقاد، بھارت کی امارہ داری کی برملا مخالف، پاکستان سے برادرانہ تعلقات کی حامی، مسلم دنیا سے روابط کی علم بردار اور مسلم قومیت کی طرف دار تھیں۔ وہ ہندو یا بھارت کی پشت پناہ عوامی لیگ کے مقابلے میں ایک مضبوط سیاسی قوت تو تھیں، لیکن مکمل اکثریت کی حامل نہیں۔ ایسی

اضطرابی کیفیت میں جماعت اسلامی بنگلہ دیش کا غیر جانبدار رہنا یا کسی تیسری قوت کی تائید میں جانا اور بیگم خالدہ ضیاء کی مخالفت کرنا واضح طور پر حسینہ واجد صاحبہ کی حمایت میں جاتا۔ اسی لیے جماعت اسلامی نے ہندو نواز سیکولر قوت کا راستہ روکنے کے لیے، وزراء قوت کے بغیر اگر بیگم خالدہ ضیاء کی حمایت کی ہے تو بھلا اس میں کون سی غلطی کی ہے؟ وہاں کی مخصوص صورت میں جماعت اسلامی کے اس اقدام کو اگر یہاں کا کوئی سیاسی دانش ور یا صحافتی مفتی "موقع پرستی" باور کرتا ہے یا خراش آسمینی میں دین داری کے خلاف گردانتا ہے تو لامحالہ اس کی فکری گنج روئی اور سیاسی دیانت پر ماتم ہی کیا جاسکتا ہے۔ اگر اس مثال کی بنیاد پر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس صورت حال کو عمومی درجہ دے کر یہاں پر بھٹو بیگم کا ماشیہ برادر بنائے تو اس پر سخت افسوس ہوتا ہے۔ پیپل پارٹی یا اس کی قیادت کو محترمہ فاطمہ جناح کی محدود عرصے کے لیے پیش کش یا بیگم خالدہ ضیاء کے ملک میں شدید اضطرابی مجبوری پر کیسے معمول کیا جاسکتا ہے؟ جو نہ صرف تہذیبی اور فکری سطح پر، بلکہ عملی اعتبار سے بھی مغربی استعمار کی حلیف اور کئی پالیسیوں میں اس کی طرف دار ہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ایسی طعنہ زنی نہایت سنجیدہ صحافتی حلقوں نے بھی کی ہے۔ کاش وہ خود بنگلہ دیش کے حالات کا بہ چشم سر جائزہ لے کر کوئی فتویٰ صادر فرماتے اور ان کے کالم ٹکڑ کٹ جمتی سے گریز کرتے۔

### بھارت میں ہندو انتہا پرستی کا احیاء اور تحریک اسلامی

سوال: مسلم بنیاد پرستی کی جو لہر گزشتہ چند برسوں میں شدت پکڑتی جا رہی ہے، اس پر بھارت میں "بھارتیہ جنتا پارٹی" کی صورت میں ایک بڑا سخت رد عمل سامنے آیا ہے اور وہ یہ کہ "اگر دوسرے مذاہب اپنے سینکڑوں سال پرانے قوانین پر اصرار کرتے ہیں تو ہم ایسا کیوں نہ کریں؟" اس عمل اور رد عمل کے باعث آج بھی بھارت کے نہ صرف ہندو، بلکہ روش خیال مسلم رہنما بھی سیکولرزم کو مذہبی ہم آہنگی کا ذریعہ تصور کرتے ہیں، وگرنہ بھارت جیسی ریاست میں پندرہ کروڑ سے زائد مسلمانوں کا مستقبل اور گذشتہ ہزار برس کے تمام مسلم تہذیبی نشانات مٹ جانے کا شدید خطرہ ہے۔ اس صورت حال میں برعظیم پاک و ہند کے کچھ اہل نظر کی رائے کے مطابق کیا یہ مناسب



نہ ہو گا کہ برصغیر کے تمام مذاہب کے سرکردہ رہنما مل کر مذہبی بنیادوں پر سیاسی نظام نافذ کرنے پر اصرار کرنے کے بجائے سیکولر کلچر کو رواج دیں، مذہبی حوالے سے پر امن بقائے باہمی کو عام کریں، اور اسی حوالے سے اپنے مذاہب کی صرف تبلیغ و اشاعت اور محض رفاه عامہ کا کام کریں اور بھارت میں یرغمال مسلمانوں کو بچانے اور ان کا مستقبل سنوارنے کا کام کریں؟

جواب: میرے بھائی، اگر یہی کام کرنا تھا تو پھر پاکستان بنانے کی قطعاً ضرورت نہ تھی۔ آپ کے سوال میں پوشیدہ یہ "ہمدردانہ مشورہ" قیام پاکستان کی ساری بنیادی اپروچ ہی سے متضاد ہے۔ یہ بات بھی غلط فہمی پر مبنی ہے کہ بھارت میں جس چیز کو آپ "ہندو بنیاد پرستی" کہہ رہے ہیں اس کی تاریخ ولادت، شاید پاکستان میں اسلامی نظام کی بات یا اسلامی لٹاٹا ثانیہ کی تحریک کے وجود میں آنے سے متعلق ہے۔ میں بڑے ادب سے کہوں گا کہ جو حضرات یہ بات کہتے ہیں وہ اس برصغیر کی تاریخ سے واقف نہیں۔ برصغیر میں "عہدِ محمدی" کی تحریک انیسویں صدی کے آخر میں شروع ہوئی، جبکہ اس سے قبل "سنگھن" وغیرہ کی تحریکیں بھی "رام راج" کی پکار تھیں۔ سید احمد شہید کی تحریک حماد جو بر عظیم پاک و ہند میں مغربی استعمار اور "سکھ شاہی" کے لیے مزاحمت کی سب سے بڑی قوت تھی۔ اس تحریک کا توڑ کرنے کے لیے جو مختلف فتنے جنم دیے گئے، ان میں ایک قادیانیت کا فتنہ بھی تھا۔ مذہبی فرقہ پرستی کا فتنہ بھی تھا اور اسی تسلسل میں ہندو احیاء پرستی کا اقدام بھی تھا۔ انیسویں صدی میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد اور خصوصیت سے تحریک مجاہدین کے مقدمات اور ۱۸۸۴ء میں ان کا جو آخری مقدمہ ہوا اس میں آپ دیکھیں گے کہ یہ سب کچھ اس وقت پروان چڑھ چکا تھا۔ "دھرتی ماتا" کی محبت اور دھرم سے شیفٹنگی کے اس ہندو لعرے کی رہنمائی اور آبیاری انگریزوں نے کی تھی۔ اس وقت سے لے کر پہلی جنگ عظیم کے بعد تک ہندو بنیاد پرستی اور ٹھیٹھ ہندو قوم پرستی سے سرشار پر تشدد تحریک اپنے عروج کو پہنچ چکی تھی۔ یہی وہ پس منظر تھا جس میں ہندو مسلم فسادات رونما ہوئے اور ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف تشدد کا استعمال کیا۔ اسی دوران مسٹر گاندھی کے باطن میں چھپا ہوا برہمن بے نقاب ہوا تھا۔ یاد رہے کہ ۱۹۲۳ء سے پہلے برصغیر کی تاریخ میں مسلمانوں کے ۹۰۰ سالہ دور اقتدار اور انگریز کے سوسالہ دور میں کبھی ہندو مسلم فساد رونما نہیں ہوئے تھے۔ "بھارتیہ جنتا پارٹی" اس وقت وجود میں نہیں آئی تھی۔ لیکن "راسٹر یہ سوامی سیوک سنگھ"

(RSS) قائم ہوا اور یہ ان کی مسلح فوج تھی۔ پنڈت مدن موہن مالویہ اس کے فکری لیڈروں میں تھے۔ جو پہلے پہل تو ہمارے ہندوستانی مسلم قائدین مولانا محمد علی جوہر، عبدالباقی فرنگی محل، قائد اعظم اور دوسرے اکابر مسلمانوں کے مدد و مدد دہ تھے، "خلافت تحریک" کے ہمنوا بھی تھے، لیکن مسلمان قائدین کی وسعت قلبی اور وسیع الشہرتی بھی گاندھی جی اور موہن مالویہ جی کے ذہن میں جمے ہوئے اس برہمنی تعصب اور تنگ نظری کو نہ دھوسکی۔ یہ پارٹی ہندو مذہبی انتہا پرستی اور ہندو قوم پرستی پر مبنی تھی۔ پھر اس نے "جن سنگھ" کو جنم دیا اور آخر کار بھارتی جنتا پارٹی کا روپ سامنے آیا۔ اب اگر اپنے ہندو تعصب اور مسلمانوں سے نفرت کے ارتقاء کو یہ لوگ پاکستان میں اسلامی نظام کی تحریک کا رد عمل قرار دیتے ہیں، تو یہ ان کی علمی بددیانتی کا ثبوت ہے۔ لیکن جو مسلمان ان کی ایسی باتیں سن کر اسلامی احیاء کی تحریک کی مذمت کرتے ہیں تو دراصل وہ اپنے مطالعہ تاریخ کی نفی کرتے ہیں۔

آپ اس پس منظر میں پورے معاملے کو دیکھیں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ بھارت میں ہندو تعصب اور انتقام کی موجودہ لہر کا کوئی تعلق پاکستان کی تحریک لفاظ اسلام کی ضد سے نہیں بلکہ یہ محض Anti Muslim تحریک ہے، جس کی جڑیں انیسویں صدی میں مضبوط کی گئی تھیں۔ ایک پہلو اور بھی قابل غور ہے۔ تمام اہم سیاسی تجزیہ نگار اس امر پر متفق ہیں کہ ہندو انتہا پسندی کی تازہ رو کو پروان چڑھانے میں خود اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی کا غیر معمولی حصہ ہے۔ جنوبی بھارت میں مسلمانوں کی دعوتی سرگرمیوں کے نتیجہ میں نجلی ذات کے لوگ جب اسلامی کی طرف متوجہ ہوئے تو خود اندرا گاندھی اور بھارت کی برہمن اسٹیبلشمنٹ نے اس دوران باقاعدہ ہندو انتہا پسندی کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ خصوصیت سے شمالی بھارت کی ہندو بیلٹ [ہیٹی] میں مسلم کش فسادات کی ایک رو چل پڑی۔ باری مسجد کے مسئلہ کو اٹھایا گیا۔ مسلمانوں کے عائلی قوانین کو متنازع بنایا گیا اور محض سیاسی فائدہ اٹھانے کے لیے مذہبی تعصب کی فضا پیدا کی گئی۔ لیکن تاریخ کی ستم طریفی ہے کہ کانگریس جس نے اس فضا کو پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا، وہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکی اور اصل فائدہ بھارتیہ جنتا پارٹی کو پہنچا۔ فاعتبرو ایہ اولی الابصار۔

بھگت دیش کے قیام کے بعد ہندوؤں نے اس بات کو محسوس کیا کہ اب رد عمل کے طور پر بھارتی مسلمانوں کا خود اپنے اوپر اعتماد بڑھ رہا ہے اور وہ اپنے ووٹ کا سیاسی دباؤ استعمال کر رہے ہیں۔ خاص طور سے بھارتی وزیر اعظم مرنندرا گاندھی نے ۱۹۷۵ء میں جب اسیروں کو رہائی دی تھی اس دوران مسلمانوں کی "نس بندی" کا مسئلہ بنیادی موضوع بنا۔ مسلمانوں نے اس کے خلاف جدوجہد



کی اور مسلم ووٹ نے کانگریس کی پہلی شکست میں بڑا کلیدی کردار ادا کیا۔ دراصل یہ وہ مقام ہے جہاں پر ہندو انتہا پسندی نے ایک خاص سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اس کی بھی فکری بنیادیں انیسویں صدی سے اٹھانی جا رہی تھیں، اس لیے یہ چیز یکایک نہیں ہوئی۔

اسی طرح میری نگاہ میں یہ بہت لمبے عرصہ تک رہنے والی چیز نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندو ازم میں اجتماعی معاملات کے لیے کوئی واضح تصور حیات موجود نہیں ہے۔ معاشرت اور عدل کے بارے میں ان کے ہاں کوئی قابل لحاظ رہنمائی نہیں ملتی۔ مجھے "رسائل و مسائل" میں سے مولانا مودودی کی وہ تحریر یاد آ رہی ہے جس میں انھوں نے ایک ہندو سے یہ کہا تھا کہ اگر آپ کے پاس حقیقی الہامی مذہبی ہدایت موجود ہو اور آپ اس کے مطابق معاملات چلانا چاہیں اور فی الحقیقت اللہ کی بندگی پر مبنی کوئی راستہ اختیار کر لیں تو اس میں آپ کی خیر ہوگی، لیکن آپ کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ہے تو پھر آپ کو تعصب سے کام نہیں لینا چاہیے، بلکہ جس مذہب کے پاس الہامی ہدایت پر مبنی نظام زندگی موجود ہے اسے اختیار کرنا چاہیے، اسی میں انسانیت کی خیر ہے۔ دراصل یہی وہ شعور ہے جس پر پاکستان کی پوری تحریک وجود میں آئی۔

اگر ہمیں مجوزہ خوش نما سیکولر ازم کے سائے تلے محض "مذہبی رواداری" کے نام پر کوئی نظام بنانا تھا، تو اس کے لیے ہمیں یہ پاکستان قائم کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ پھر یہ بھی ایک معروضی حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب نے آج انسان، معاشرے، اسٹیٹ اور قوم کے جو تصورات دیے ہیں وہ ایک ایک کر کے منہدم ہو رہے ہیں۔ کمیونزم نے اس کے مقابلے میں جو بند کھڑا کرنے کی کوشش کی تھی، وہ بھی تنکے کی طرح بہہ گیا۔ ان حالات میں وہ ہدایت، وہ اصول اور وہ نظام جس کی بنیاد پر انسانیت کے مسائل فی الحقیقت حل ہو سکیں، صرف اور صرف اسلام ہے۔ اسلام صرف پاکستانیوں کا دین نہیں ہے، اسلام پر محض لسانی مسلمانوں کی اجارہ داری نہیں ہے، بلکہ اسلام تو وہ پیغام ہے جو انسانیت کو زندگی، بقا اور تہذیب کا راستہ سکھانے کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ یہی ہمارا دعویٰ ہے اور یہی پیغام۔

آپ نے سوال میں ہندو انتہا پسندی کے علاج کے لیے جو دو تجویز کی ہے وہ تو دراصل مسلمانوں کے پورے نظام کو دریا برد کرنے کے مترادف ہے۔ اسی لیے ہم تو اس نوعیت کی "ہمدردانہ اور دانش ورانہ" تہاؤز کے باغی ہیں۔ گو آج کے انسان نے لٹرائی میں پرندوں کی طرح اڑنا اور سمندر میں مچھلیوں کی طرح تیرنا سیکھ لیا ہے، لیکن بد قسمتی سے زمین پر انسانوں کی طرح رہنا نہیں سیکھا۔ اسلام ہی دراصل زمین پر انسانوں کی طرح رہنا سکھاتا ہے اور ہم یہی معاشرہ

قائم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر یہ قائم ہو جاتا ہے تو پھر ان شاء اللہ اس کے اچھے اثرات بھارتی ہندوؤں پر بھی پڑیں گے اور وہاں کے مظلوم مسلمانوں اور مقہور ہریمنوں پر بھی پڑیں گے۔ کیونکہ اسلام میں مذہبی رواداری کا ان لوگوں نے ابھی تک تقارہ نہیں کیا، بلکہ اس وقت جب کہ پاکستان میں اسلامی نظام نافذ بھی نہیں ہے، تب بھی پاکستان کا اپنی اقلیتوں کے ساتھ رویہ کسی بھی دوسرے ایشیائی ملک سے بہتر، بلکہ بہت زیادہ بہتر ہے۔





(RSS) قائم ہوا اور یہ ان کی مسلح فوج تھی۔ پنڈت مدن موہن مالویہ اس کے فکری لیڈروں میں تھے۔ جو پہلے پہل تو ہمارے ہندوستانی مسلم قائدین مولانا محمد علی جوہر، عبدالباقی فرنگی محل، قائد اعظم اور دوسرے اکابر مسلمانوں کے مدد و مدد دہن تھے، "خلافت تحریک" کے ہمنوا بھی تھے، لیکن مسلمان قائدین کی وسعت قلبی اور وسیع الشہرتی بھی گاندھی جی اور موہن مالویہ جی کے ذہن میں جمے ہوئے اس برہمنی تعصب اور تنگ نظری کو نہ دھوسکی۔ یہ پارٹی ہندو مذہبی انتہا پرستی اور ہندو قوم پرستی پر مبنی تھی۔ پھر اس نے "جن سنگھ" کو جنم دیا اور آخر کار بھارتی جنتا پارٹی کا روپ سامنے آیا۔ اب اگر اپنے ہندو تعصب اور مسلمانوں سے نفرت کے ارتقاء کو یہ لوگ پاکستان میں اسلامی نظام کی تحریک کا رد عمل قرار دیتے ہیں، تو یہ ان کی علمی بددیانتی کا ثبوت ہے۔ لیکن جو مسلمان ان کی ایسی باتیں سن کر اسلامی احیاء کی تحریک کی مذمت کرتے ہیں تو دراصل وہ اپنے مطالعہ تاریخ کی نفی کرتے ہیں۔

آپ اس پس منظر میں پورے معاملے کو دیکھیں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ بھارت میں ہندو تعصب اور انتقام کی موجودہ لہر کا کوئی تعلق پاکستان کی تحریک لفاظ اسلام کی ضد سے نہیں بلکہ یہ محض Anti Muslim تحریک ہے، جس کی جڑیں انیسویں صدی میں مضبوط کی گئی تھیں۔ ایک پہلو اور بھی قابل غور ہے۔ تمام اہم سیاسی تجزیہ نگار اس امر پر متفق ہیں کہ ہندو انتہا پسندی کی تازہ رو کو پروان چڑھانے میں خود اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی کا غیر معمولی حصہ ہے۔ جنوبی بھارت میں مسلمانوں کی دعوتی سرگرمیوں کے نتیجہ میں نجلی ذات کے لوگ جب اسلامی کی طرف متوجہ ہوئے تو خود اندرا گاندھی اور بھارت کی برہمن اسٹیبلشمنٹ نے اس دوران باقاعدہ ہندو انتہا پسندی کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ خصوصیت سے شمالی بھارت کی ہندو بیلٹ [ہیٹی] میں مسلم کش فسادات کی ایک رو چل پڑی۔ باری مسجد کے مسئلہ کو اٹھایا گیا۔ مسلمانوں کے عائلی قوانین کو متنازع بنایا گیا اور محض سیاسی فائدہ اٹھانے کے لیے مذہبی تعصب کی فضا پیدا کی گئی۔ لیکن تاریخ کی ستم طریفی ہے کہ کانگریس جس نے اس فضا کو پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا، وہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکی اور اصل فائدہ بھارتیہ جنتا پارٹی کو پہنچا۔ فاعتبرو ایہ اولی الابصار۔

بھگت دیش کے قیام کے بعد ہندوؤں نے اس بات کو محسوس کیا کہ اب رد عمل کے طور پر بھارتی مسلمانوں کا خود اپنے اوپر اعتماد بڑھ رہا ہے اور وہ اپنے ووٹ کا سیاسی دباؤ استعمال کر رہے ہیں۔ خاص طور سے بھارتی وزیر اعظم مرنندرا گاندھی نے ۱۹۷۵ء میں جب اسیروں کو رہائی دی تھی اس دوران مسلمانوں کی "نس بندی" کا مسئلہ بنیادی موضوع بنا۔ مسلمانوں نے اس کے خلاف جدوجہد



آپ کے ان تمام سوالات \* کا تعلق تربیت اور سیرت و کردار کی تعمیر سے ہے۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مختصر آ تربیت اور تعمیر سیرت کے بارے میں اپنا زاویہ نگاہ واضح کر دوں، تاکہ باقی سوالات کے بارے میں بات سمجھنے میں آسانی ہو۔

سیرت دراصل شخصیت کا دوسرا نام ہے۔ یہ فکر و عمل کی وہ کل کائنات ہے، جو خیال و ارادہ، جذبات و احساسات اور اعمال و عادات کے مستقل سانچوں سے عبارت ہو۔ تصورات، احساسات اور اعمال میں مقصدی یک رنگی سیرت کی مظہر ہے۔ اسلامی سیرت، زندگی کی اس کل شخصیت کائنات پر صفتہ اللہ کے غلبے سے رونما ہوتی ہے۔ اور ایسی سیرت ہی کی تعمیر کی جدوجہد کا نام تربیت ہے۔ اس کو قرآن کی اصطلاح میں ترمیم کہاجاتا ہے، جو بعثت انبیاء علیہم السلام کا ایک بنیادی مقصد رہا ہے۔ ہمارا تصور تربیت جن حقائق پر مبنی ہے، وہ "سیرت" کی تعریف سے آپ سے آپ واضح ہوجاتے ہیں۔

الف: سیرت کا تعلق محض رویہ سے نہیں ہے۔ بلکہ یہ فکر، جذبات اور اعمال ان تینوں پر محیط ہے اور ان کے ایک مقصدی سلسلے میں منسلک ہوجانے سے رونما ہوتی ہے۔

ب: سیرت، زندگی کے کسی ایک یا چند مخصوص گوشوں سے متعلق نہیں، بلکہ پوری شخصیت

\*

۱. معاشرے میں فرد کے سیرت و کردار کی کیا اہمیت ہے؟
۲. اخلاقی زوال کے کیا نتائج ہوتے ہیں؟
۳. انگریزوں کی غلامی نے ہمارے قومی کردار میں کس خرابیوں کو جنم دیا؟
۴. مجموعی قومی کردار کی تعمیر کے لیے موثر تدابیر کون سی ہیں؟
۵. آج کے بگڑے ہوئے ماحول میں اپنے کردار کی تعمیر، بلکہ حفاظت کی خاطر اجتماعی زندگی سے علاحدگی کا رجحان آپ کی نظر میں کیا ہے؟
۶. تربیت کی اصل بنیاد خود اپنا ارادہ و کوشش ہے، اسے مسلسل بیدار رکھنے کے لیے کیا کیا جانا چاہیے؟
۷. انفرادی سیرت کی تعمیر کے لیے تحریک اسلامی کون سے مواقع فراہم کرتی ہے اور ان سے کساحقہ، مستفید ہونے کے لیے ایک فرد کو کیا کرنا چاہیے؟

پر حاوی ہے۔ تنہائی میں دل میں پیدا ہونے والے خیالات سے لے کر دوسرے انسانوں سے معاملات کرنے تک، ہر چیز اس میں شامل ہے۔ زندگی ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ سیرت کا تعلق پوری زندگی اور شخصیت سے ہے۔ کوئی پہلو اور کوئی گوشہ اس کے دائرے سے باہر نہیں۔ اسلام پوری زندگی کو انفرادی اور اجتماعی، نجی اور معاشرتی، عائلی اور سیاسی، معاشی اور ملکی، قومی و بین الاقوامی قوانین، روایات اور ضوابط کو اپنے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ۔  
اے لوگو جو ایمان لائے ہو اسلام میں داخل ہو جاؤ پورے کے پورے، اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ (یعنی زندگی کو خافہ میں تقسیم کرنا)۔

ج: سیرت کی یہ تعمیر زندگی کی کشمکش کے درمیان ہوتی ہے، کسی گوشہ تنہائی میں نہیں، سیرت زندگی سے فرار سے نہیں۔ زندگی کی تعمیر سے جتنی ہے۔ جس طرح انسان پانی میں اترنے کے بعد ہی تیرنا سیکھتا ہے، اسی طرح کشمکش حیات کے دوران ہی انسان کی شخصیت اور سیرت کی تعمیر و ترقی کا شہر سایہ دار پھلتا اور پھولتا ہے۔

د: سیرت کا محل فرد کا اپنا دل ہے۔ اس کی زندگی، اس کی اصلاح اور اس کی صورت گری اصل مطلوب ہے۔ اگر یہ سفور جائے تو پوری زندگی سفور جاتی ہے۔ اور اگر یہ اصلاح قبول نہ کرے تو اصلاح کی طرف کوئی قدم نہیں بڑھ پاتا ہے۔ سچ کہا سب سے سچے انسان ﷺ نے:

"خبردار! بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ کہ جب وہ درست ہو تو سارا بدن درست ہوتا ہے۔ اور وہ بگڑ جائے تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے۔ ہوشیار کہ وہ (گوشت کا ٹکڑا) دل ہے۔"

ان حقائق کی روشنی میں، میں اب آپ کے سوالات کو لیتا ہوں۔

1

معاشرے میں فرد کے سیرت و کردار کی کیا اہمیت ہے؟  
معاشرے میں فرد کی سیرت و کردار کی اہمیت کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے یہ

سمجھ لیں کہ معاشرہ ہے کیا؟

معاشرہ انسانوں کے اس مجموعہ کا نام ہے جو باہم مل جل کر ساتھ رہنا چاہتے ہوں۔ جو مختلف نظریاتی، تاریخی یا تہذیبی تعلقات کی بدولت ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہوں۔ بنیادی طور پر دو چیزیں معاشرہ کی اساس ہیں:

الف۔ افراد کا مجموعہ۔

ب۔ ان کا احساس کہ ہمیں ساتھ رہنا ہے۔

اسباب، وجوہ اور محرکات خواہ کچھ بھی ہوں، اگر معاشرہ افراد کے مجموعہ کا نام ہے، تو پھر جیسے افراد ہوں گے، ویسا ہی معاشرہ بھی ہوگا۔ کھوٹے سکول کا خواہ کتنا ہی بڑا انبار ہو، وہ کھوٹے ہی نہیں گے۔ کانٹوں کی تعداد خواہ کتنی ہی ہو، ان میں گلوں کی خوشبو پیدا نہیں ہو سکتی۔ پتھر جس تعداد میں بھی جمع کر دیے جائیں وہ سنگ ہی رہیں گے بیرے سنیں ہی سکتے۔ اس لیے معاشرے کا حسن اور توازن قائم ہی اس وقت ہو سکتا ہے، جب ہر فرد یا کم از کم افراد کی ایک معقول اور موثر تعداد کی انفرادی سیرت اچھی ہو۔

دوسری اہم تر بات یہ ہے کہ تاریخ سب سے اہم قوت اجتماع نہیں، افراد میں۔ زندگی کے بناؤ اور بگاڑ کا انحصار افراد، ان کے تصورات اور ان کی جدوجہد پر ہے۔ اجتماع (Social Order) کی بڑی اہمیت ہے۔ لیکن آخری تجربہ میں اس کی قسمت کا انحصار افراد ہی پر ہے۔ اگر فرد اور معاشرہ میں ہم آہنگی ہے تو وہ دونوں کے لیے مفید ثابت ہوگی۔ اور اس کے نتیجے میں ایک صحت مند تہذیب بھی رونما ہوگی۔ کسی معاشرے میں کوئی تبدیلی مقصود ہو تو ایسی تبدیلی بھی افراد ہی کی مساعی سے ہوتی ہے اور اجتماع کا رنگ بدل جاتا ہے۔ یہ کام دیوی لوگ انجام دیتے ہیں جو مضبوط سیرت کے حامل ہوں اور خود اجتماع کے رنگ میں رنگنے کی بجائے اس کے رنگ کو بدل ڈالنے کا عزم رکھتے ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ افراد کی سیرت و کردار معاشرے کی اصلاح اور تاریخ کی تعمیر میں بڑا اہم اور مثبت رول ادا کرتے ہیں۔

پھر اگر آپ اسلامی تعلیمات پر غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ اسلام نے معاشرے کو بدلنے اور اسے صحیح خطوط پر تعمیر کرنے کی ذمہ داری فرد پر عائد کی ہے۔ اور ہر فرد کو اللہ تعالیٰ کے سامنے انفرادی طور پر جواب دہ قرار دیا ہے۔



اسی طرح اگر آپ سیرت سازی کے عمل پر غور کریں گے تو پائیں گے کہ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ عمل انفرادی ہے۔ اس میں فرد کا ارادہ اور اس کی مساعی ہی اصل فیصلہ کن چیز ہیں۔ اجتماعی ماحول مددگار بھی ہو سکتا ہے اور مائع بھی، لیکن سب سے اہم قوت فرد کی سعی و جہد ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ ایک اچھا معاشرہ چاہتے ہیں، تو اس کا انحصار افراد ہی کے سیرت و کردار پر ہوگا۔

فرد کی اہمیت کے ان تمام پہلوؤں کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک بات کی وضاحت کر دوں۔ جہاں تک میں نے سیرت طیبہ ﷺ کا مطالعہ کیا ہے، مجھے اس سے یہی پیغام ملا کہ زندگی کے دھارے کو موڑنے کے لیے پہلا قدم افراد کی تیاری اور تربیت ہے۔ البتہ چونکہ یہ فرد ایک خاندان، ایک محلہ، ایک سوسائٹی، ایک ریاست اور ایک تہذیب کی آشوش میں جنم لیتا اور ترقی کرتا ہے، اس لیے مکمل اصلاح کے لیے ان تمام اداروں کا بھی اس مقصد اور مشن سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی درجے میں فرد کی زندگی اور اس کی شخصیت کے ابعاد، تعمیر اور تشکیل کو متاثر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرد کی اصلاح کے ساتھ ان افراد کو دعوت و ارشاد، اجتماعی اصلاحی جدوجہد اور معاشرہ اور ریاست کے اداروں کی تعمیر نو کا ہدف دیا جائے، تاکہ اس جدوجہد کے نتیجہ میں مکمل اصلاح رونما ہو سکے۔ اور یہی اصل مطلوب ہے۔

۲

اخلاقی زوال کسے کیا نتائج ہوتے ہیں؟

اخلاقی زوال کے نتائج کی پوری فہرست مرتب کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اس کا پہلا نتیجہ ایسا ہے کہ وہ سب کچھ لے ڈوبے اور وہ ہے تباہی، فرد اور معاشرہ کی، دنیا اور آخرت میں۔ آپ شاید اس سے توافق کریں کہ:

زندگی کیا ہے، عناصر میں تصور ترتیب

موت کیا ہے، انہی اجزا کا پریشان ہونا

اور یہ ترتیب، بلکہ حسن ترتیب، اخلاقی کی قوت کے ذریعے قائم ہوتی ہے۔ اس کے کمزور ہونے

پر انتشار پیا جاتا ہے۔ یہ اصول فرد اور معاشرہ دونوں کے بارے میں صادق آتا ہے۔

۳

انگریزوں کی غلامی نے ہمارے قومی کردار میں کئی خرابیوں کو جنم دیا ہے؟

یہ پوچھیے، کہ کون سی خرابی کو جنم نہیں دیا؟۔۔۔ غلامی خود ام النہایت ہے۔ اس میں زندگی صرف "جوئے کم آب" ہی نہیں بن جاتی بلکہ اس کا صاف و شفاف پانی بھی زہر آلود ہو جاتا ہے۔ یہ فرد اور قوم دونوں کی خودی کو مغلوب، مصلح اور بالآخر مردہ کر دیتی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ قتالی، بروپیا پن اور لفاق کو جنم دیتی ہے۔ گ سیاسی غلامی معاشی محکومی کے پھندے تیار کرتی ہے۔ ان دونوں کے جلو میں معاشرتی تقلید رونما ہوتی ہے۔ پھر اخلاقی استیلا اور ذہنی انتشار کا آغاز ہوتا ہے اور ایک زندہ قوم تمدنی موت مر جاتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے صحیح کہا تھا کہ:

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا

کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

دور غلامی میں ہمارا سابقہ جس دشمن سے تھا، اس نے ہماری قوم کو ان امراض میں مبتلا کر دیا، جو آج اس کو ٹھن کی طرح کھائے جا رہے ہیں۔ میں یہاں چند ایک کا ذکر کرتا ہوں:

۱۔ ذہنی پراگندگی

ہمیشہ سے مسلمانوں کی ایک خصوصیت، اسلام کے بارے میں ذہنی یکسوئی رہی ہے۔ لیکن اس زمانہ میں ہمیں اس سے محروم کر دیا گیا۔ اور ذہنی و فکری طور پر انتشار، بے اطمینانی اور تشکیک کی کیفیت پیدا کر دی گئی۔۔۔ یہ صورت، آزادی کے بعد بھی جاری ہے اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے سیاسی آزادی کے باوجود ذہنی اور تمدنی غلامی سے آزادی حاصل نہیں کی ہے۔

15818

## ۲۔ لفاق

قوم میں زندگی کے ہر شعبہ میں لفاق اور قول و عمل کی عدم مطابقت رونما ہو گئی ہے۔ اس روگ نے ہماری اخلاقی قوت کو ختم کر دیا ہے۔ پھر اس کے شاخسانہ کے طور پر ایک اور چیز بھی رونما ہوئی ہے۔ یعنی خوشامد --- صلاحیت (Merit) کے مقابلہ میں خوشامد، سفارش اور اقربا پروری کا مرض بھی بڑے پیمانے پر رونما ہوا ہے۔

## ۳۔ اجتماعی اداروں کی تباہی

سیاسی اقتدار سے محرومی کے بعد سامراجی حکمرانوں نے ہمارے ان تمام اداروں (Institutions) کو تباہ کیا جو ملت اسلامیہ کے شیرازہ کو مضبوط کیے ہوئے تھے۔ پہلی ضرب فوجداری قانون پر پڑی اور پھر دیوانی قانون پر۔ اس کے بعد معیشت، عدالت، اور استقامیہ سے مسلمانوں کی تطہیر کی گئی۔ ساتھ ہی مغربی قانون اور ادارے کو ہمارے معاشرہ پر مسلط کرنے کا کام ہوا۔ اس کے ساتھ تعلیم کا نظام یکسر بدلا گیا اور بالآخر ضرب خود خاندان کے نظام پر پڑی جو ہمارا آخری حصار تھا۔ جدید سیاسی محکومی کے دور کا ایک بڑا ہی تباہ کن نتیجہ مسلم معاشرے کے اداروں کا انہدام اور ان کی جگہ معاشرہ پر جبر کے ذریعے مغربی قوانین اور اداروں کو مسلط کرنا ہے۔

## ۴۔ فاسق قیادت

مسلمانوں کی یہ بھی ایک خصوصیت رہی ہے کہ ان کی حقیقی قیادت، ہمیشہ اہل خیر کے ہاتھوں میں رہی ہے۔ اگر سیاسی غلبہ بے کردار لوگوں کو حاصل ہو بھی گیا تو زندگی کے دوسرے تمام شعبوں میں صالح افراد ہی مرجع خلافت رہے ہیں۔ اس طرح اجتماعی امور میں بھی دلوں پر حکومت کرنے والے علمائے حق اور صلہائے امت ہی تھے۔ دور غلامی میں جو انقلاب معکوس آیا ہے، اس کے نتیجہ میں علماء و صلحاء اجتماعی زندگی میں قیادت کے منصب سے گویا ہٹا دیئے گئے ہیں۔ اکثر شعبوں میں تو جن لوگوں کے ہاتھ میں قیادت آئی ہے، ان کی زندگیاں اسلام کے معیار قیادت سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی ہیں۔ اس چیز نے پوری امت کو زبردست نقصان پہنچایا ہے۔ اس لیے میرے خیال میں ہمارے بہت سے مسائل کی جڑیسی کشمکش ہے۔

## ۵۔ مغرب کا تمدنی ظلم

یورپ کی کورانہ قتالی کا مرض بھی انگریزوں کی غلامی ہی کی پیداوار ہے۔ مغربی استعماری قوتوں کے تمدنی ظلم (Cultural Imperialism) کی پالیسی کی کامیابی کا ایک مظہر یہ چیز بھی ہے، جو اپنے نتائج کے اعتبار سے ایک قوم کی تخلیقی صلاحیتوں کے لیے پیغام موت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور کبھی اسے اپنی حقیقی قامت (Stature) حاصل نہیں کرنے دیتی۔

۴

۴

"مجموعی قومی کردار کی تعمیر کے لیے موثر تدابیر کون سی ہو سکتی ہیں؟"

میری رائے میں اس کے لیے سب سے پہلی ضرورت تو یہ ہے کہ ہماری قوم کی جو امتیازی حیثیت اور اس کا جو تاریخی مزاج ہے، وہ شخص کیا جائے۔ اور وہ ہے اسلام

اپنی ملت پر قیاس اقوام مغرب سے نہ کر

خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی ﷺ

فی الحقیقت اسلام ہی ہماری بنیاد ہے۔ اسلام ہی ہمارا ملی نصب العین ہے اور اسلام ہی ہمارے لیے کردار ساز قوت ہے۔ ہماری نگاہ میں سیرت سازی کے لیے نصب العین کا مسئلہ سب سے اہم اس لیے ہے کہ اسلام اسے بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ سیرت کے بغیر مجموعی قومی کردار کی تعمیر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب تک ہم یہ نہ جان لیں کہ کون سا کردار ہمیں مطلوب ہے، اس وقت تک کردار سازی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت عملی طور پر حالت یہ ہے کہ قوم کے سامنے کوئی نصب العین اور واضح سمت ترقی (Direction) نہیں ہے۔ لے دے کے ایک معاشی ترقی کا ڈھونگ، نعروں اور الٹا معاشی ٹکڑی کی شکل میں ضرور رہا یا جا رہا ہے۔ لیکن پاکیزہ قومی کردار کی تعمیر کے نقطہ نظر سے اس سے زیادہ نقصان دہ "نصب العین" کوئی نہیں ہو سکتا۔ معاشی ترقی ہمیں ضرور مطلوب ہے۔ لیکن اسلامی احیاء کے ایک جزو کی حیثیت سے چاہیے، مطلوب فی الذات کی حیثیت سے نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد پر قومی کردار کیسے تعمیر ہو۔ ہمارے نزدیک میں اس

پر حاوی ہے۔ تنہائی میں دل میں پیدا ہونے والے خیالات سے لے کر دوسرے انسانوں سے معاملات کرنے تک، ہر چیز اس میں شامل ہے۔ زندگی ایک ناقابل تقسیم وحدت ہے۔ سیرت کا تعلق پوری زندگی اور شخصیت سے ہے۔ کوئی پہلو اور کوئی گوشہ اس کے دائرے سے باہر نہیں۔ اسلام پوری زندگی کو انفرادی اور اجتماعی، نجی اور معاشرتی، عائلی اور سیاسی، معاشی اور ملکی، قومی و بین الاقوامی قوانین، روایات اور ضوابط کو اپنے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ۔  
اے لوگو جو ایمان لائے ہو اسلام میں داخل ہو جاؤ پورے کے پورے، اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ (یعنی زندگی کو خافہ میں تقسیم کرنا)۔

ج: سیرت کی یہ تعمیر زندگی کی کشمکش کے درمیان ہوتی ہے، کسی گوشہ تنہائی میں نہیں، سیرت زندگی سے فرار سے نہیں۔ زندگی کی تعمیر سے بنتی ہے۔ جس طرح انسان پانی میں اترنے کے بعد ہی تیرنا سیکھتا ہے، اسی طرح کشمکش حیات کے دوران ہی انسان کی شخصیت اور سیرت کی تعمیر و ترقی کا شہر سایہ دار پھلتا اور پھولتا ہے۔

د: سیرت کا محل فرد کا اپنا دل ہے۔ اس کی زندگی، اس کی اصلاح اور اس کی صورت گری اصل مطلوب ہے۔ اگر یہ سفور جائے تو پوری زندگی سفور جاتی ہے۔ اور اگر یہ اصلاح قبول نہ کرے تو اصلاح کی طرف کوئی قدم نہیں بڑھ پاتا ہے۔ سچ کہا سب سے سچے انسان ﷺ نے:

"خبردار! بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے۔ کہ جب وہ درست ہو تو سارا بدن درست ہوتا ہے۔ اور وہ بگڑ جائے تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے۔ ہوشیار کہ وہ (گوشت کا ٹکڑا) دل ہے۔"

ان حقائق کی روشنی میں، میں اب آپ کے سوالات کو لیتا ہوں۔

1

معاشرے میں فرد کے سیرت و کردار کی کیا اہمیت ہے؟  
معاشرے میں فرد کی سیرت و کردار کی اہمیت کو جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے یہ

### ۴۔ تاریخ اور روایت سے تعلق

قومی کردار کی تعمیر میں اپنی تاریخ سے واقفیت، سلف صالحین سے والہانہ محبت اور ماضی کے کارناموں پر بھاطور پر فخر بھی بے حد ضروری ہے۔ کوئی قوم اپنے ماضی سے گھرے ربط کے بغیر قومی حیثیت سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ جن اقوام کا کوئی ماضی نہ تھا انہوں نے ایک ماضی تصنیف کر لینے میں کسی پس و پیش سے کام نہ لیا۔ جبکہ ہمیں اپنے ماضی سے گھر ا ربط قائم کرنے کے لیے تاریخی اور دستاویزی کتب سے مل سکتا ہے۔ اس مقصد کے لیے آسان زبان میں تاریخ کے اہم واقعات کی تدوین، افسانوں، کہانیوں اور تاریخی لکھنوں کے ذریعے ماضی کے ولولہ انگیز واقعات کا بیان، تاریخی نمائشوں اور گفتنی نمائش گاہوں (Mobile Exhibitions) وغیرہ کے ذریعے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ہم ویسے تو اپنی پوری تاریخ کو پیش کریں۔ لیکن سب سے زیادہ اہمیت دور رسالت مابین ﷺ اور خلافت راشدہ نمودیں۔ اور سیرت پاک ﷺ اور سیرت صلحاء کو اس پورے پروگرام میں مرکزی حیثیت حاصل ہو۔ اب تک مسلمانوں کو جس چیز نے جوڑے رکھا ہے، وہ حضور پاک ﷺ کی ذات اور سیرت پاک سے اس کا تعلق ہے۔ آج یہ تعلق محض ہو رہا ہے۔ ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ ہماری ملی تعمیر کا انحصار ہمیشہ اس پر ہو گا کہ حضور اکرم ﷺ سے ہمارا تعلق کتنا گہرا اور کتنا مضبوط ہے یہی اس کا ذریعہ ہے اور یہی اس کا پیمانہ

مصطفیٰؐ بہ رسالہ راہ کہ ایں ہم اوست  
اگرچہ او نہ رسدی تمام بولہبی ست

### ۵۔ نظام قانون کی اصلاح

اگر ایک قوم کی اخلاقی قوت وہ جوہری قوت رہے جو اس کی زندگی کی گاڑی کو چلاتی ہے۔ اس اعتبار سے قانون کی حیثیت گیر (Gear) اور بریکوں (Brakes) کی ہے، جن کے ذریعے اس کے پورے نظام اور کارکردگی کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔ ہمارا پورا نظام قانون تبدیل چاہتا ہے۔ اور جب تک اسے اسلامی مزاج اور قرآن اور حدیث کے احکامات سے ہم آہنگ نہ کر لیا جائے، قومی کردار کی تعمیر کا کام صحیح خطوط پر ٹھیک رفتار سے انجام نہ پاسکے گا۔

## ۶۔ اسلامی حکومت کا قیام

اسلامی حکومت کا قیام بھائے خود اس مقصد کے لیے ضروری ہے، جس میں قیادت کی حیثیت اس گاڑی کے ڈرائیور کی سی ہے۔ اس خاص سمت میں قوم کو لے جانے کی ذمہ داری قیادت ہی پر عائد ہوتی ہے۔ اسلام اس وقت تک یہاں زندہ حقیقت نہ بن سکے گا، جب تک ہمارے ملک میں صحیح اسلامی قیادت نہیں ابھرتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتابوں کے ساتھ جو انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا ہے تو اس کی حکمت یہ بھی تھی کہ اصلاح اور تعمیر کا کام صحیح لیڈر شپ کے بغیر انجام نہیں پاسکتا۔

## ۵

آج کے بگڑے ہوئے ماحول میں اپنے کردار کی تعمیر بلکہ حفاظت کی خاطر اجتماعی زندگی سے علیحدگی کا رجحان آپ کی نظر میں کیسا ہے؟

اجتماعی زندگی سے علیحدگی مسئلہ کا کوئی حل نہیں۔ اول تو یہی حل نظر ہے کہ اس طریقہ پر عمل پیرا ہو کر کردار کی حفاظت کی بھی جاسکتی ہے۔ یہ راہ تو اعتراف شکست ہے اور اس سے کبھی کردار کی تعمیر واقع نہیں ہو سکتی۔ پھر جب اصل میدان کار آپ نے چھوڑ دیا، تو ترقی کے مواقع باقی کہاں رہے؟ ہو سکتا ہے کہ انفرادی اخلاق کی حد تک آپ اپنے کو کچھ بچا بھی لیں۔ لیکن اجتماعی اخلاق کے وسیع دائرے کا آپ کیا کریں گے؟ تعمیر کردار کا موقع اور اس کا اصل امتحان تو آزمائش اور بگاڑ کے خلاف جدوجہد میں ہے۔ اس کے برعکس اگر علاحدگی کے اس طریقے پر عمل کرتے ہوئے تمام اچھے انسان معاشرے کو چھوڑ کر چلے جائیں، تو پھر معاشرہ کے لیے کیا رہ جائے گا؟ بدترین انسان! — اس طرح تو آپ خیر اور اصلاح کے سرچشموں ہی کو بند کر دیں گے اور دنیا کو ہوس کے بندلوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں گے۔ ذرا سوچئے کہ اس میں پایا کیا اور کھویا کیا؟

اس لیے بگڑے ہوئے ماحول سے نمٹنے کے لیے صحیح طریقہ فرار نہیں، نگر او ہے۔ گوشت عافیت تلاش کرنے کی بجائے بگاڑ سے نکل لیجئے۔ علم، دلیل، متانت، کردار اور عمل سے اس کے ساتھ جنگ لڑیئے، زندگی کے ایک ایک میدان میں اس سے پنجہ آزمائی کیجئے۔ اے اپنے لیے ایک چیلنج سمجھیے اور اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے سینہ سپر ہو جائیئے۔ یہی ہے جہاد کی

اسی طرح اگر آپ سیرت سازی کے عمل پر غور کریں گے تو پائیں گے کہ اپنی اصل کے اعتبار سے یہ عمل انفرادی ہے۔ اس میں فرد کا ارادہ اور اس کی مساعی ہی اصل فیصلہ کن چیز ہیں۔ اجتماعی ماحول مددگار بھی ہو سکتا ہے اور مائع بھی، لیکن سب سے اہم قوت فرد کی سعی و جہد ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ ایک اچھا معاشرہ چاہتے ہیں، تو اس کا انحصار افراد ہی کے سیرت و کردار پر ہوگا۔

فرد کی اہمیت کے ان تمام پہلوؤں کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ایک بات کی وضاحت کر دوں۔ جہاں تک میں نے سیرت طیبہ ﷺ کا مطالعہ کیا ہے، مجھے اس سے یہی پیغام ملا کہ زندگی کے دھارے کو موڑنے کے لیے پہلا قدم افراد کی تیاری اور تربیت ہے۔ البتہ چونکہ یہ فرد ایک خاندان، ایک محلہ، ایک سوسائٹی، ایک ریاست اور ایک تہذیب کی آشوش میں جنم لیتا اور ترقی کرتا ہے، اس لیے مکمل اصلاح کے لیے ان تمام اداروں کا بھی اس مقصد اور مشن سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے۔ ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی درجے میں فرد کی زندگی اور اس کی شخصیت کے ابعاد، تعمیر اور تشکیل کو متاثر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فرد کی اصلاح کے ساتھ ان افراد کو دعوت و ارشاد، اجتماعی اصلاحی جدوجہد اور معاشرہ اور ریاست کے اداروں کی تعمیر نو کا ہدف دیا جائے، تاکہ اس جدوجہد کے نتیجہ میں مکمل اصلاح رونما ہو سکے۔ اور پٹی اصل مطلوب ہے۔

۲

اخلاقی زوال کسے کیا نتائج ہوتے ہیں؟

اخلاقی زوال کے نتائج کی پوری فہرست مرتب کرنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ اس کا پہلا نتیجہ ایسا ہے کہ وہ سب کچھ لے ڈوبے اور وہ ہے تباہی، فرد اور معاشرہ کی، دنیا اور آخرت میں۔ آپ شاید اس سے توافق کریں کہ:

زندگی کیا ہے، عناصر میں تصور ترتیب

موت کیا ہے، انہی اجزا کا پریشان ہونا

اور یہ ترتیب، بلکہ حسن ترتیب، اخلاقی کی قوت کے ذریعے قائم ہوتی ہے۔ اس کے کمزور ہونے



۳۔ عبادات کا اہتمام۔۔۔ عبادات ادا تو آپ کرتے ہی ہیں، شعوری طور پر ایمان اور اعتساب کے ساتھ ان کو ادا کرنے کا اہتمام کیجیے۔ اس سے وہ ترکیب کا ایک موثر ذریعہ بن جائیں گی محض عادات نہیں رہیں گی۔

۴۔ محاسبہ۔۔۔ انفرادی طور پر اور جب ممکن ہو تو اجتماعی طور پر بھی۔۔۔ محاسبہ کی حیثیت اس صیقل کی سی ہے جو زنگ کو دُور کر دیتا ہے، خصوصیت سے روزانہ رات کو سونے سے قبل چند منٹ میں دن بھر کی پوری کارگزاری کا جائزہ لیجیے، اس ایک چیز کو آپ تعمیر سیرت کے لیے اکسیر پائیں گے۔

۵۔ مطالعہ۔۔۔ خصوصیت سے قرآن، حدیث، سیرت اور اسلامی لٹریچر کا مطالعہ زندگی کا جز بنائیں۔

۶۔ ان چیزوں سے اجتناب جو خدا سے غافل کرتی ہے۔۔۔ خواہ ان کا تعلق کثرت مال سے ہو یا بُری کتابوں کے مطالعہ سے، یا بد کردار لوگوں کی صحبت سے، یا فُضول اور لابیسی کا ماحول سے۔

۷۔ غلبہ حق کی جدوجہد۔۔۔ اسے زندگی کا محض ایک کام نہیں بلکہ اصل کام، اپنی مصروفیات کا ایک جزو نہیں بلکہ اصل مصروفیت اور مصروفیات حیات کا ایک ضمیمہ نہیں اصل کیریئر (Career) ہونا چاہیے۔ اسے یہ مقام دے دیجیے پھر ہر لمحہ آپ تعمیر سیرت کی جدوجہد میں مصروف ہوں گے۔ اور دنیا کی ہر چیز آپ کو مانجنے، سنبھالنے اور درست کرنے میں مددگار بن جائے گی۔ کوئی چیز آپ کی معاون بن کر یہ کام کرے گی اور کوئی مزاحم بن کر، لیکن ان شاء اللہ نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہوگا: تعمیر سیرت اور غلبہ حق۔ و کلمتہ اللہ ہی العلیا

۷

انفرادی سیرت کی تعمیر کے لیے اسلامی تحریک کون سے مواقع فراہم کرتی ہے اور ان سے کما حقہ، مستفید ہونے کے لیے ایک فرد کو کیا کرنا چاہیے؟

میرے خیال میں آج یہ مواقع اسلامی تحریک ہی فراہم کر سکتی ہے۔ اس لیے کہ تعمیر سیرت کے لیے دو چیزیں درکار ہیں (۱) خدا سے صحیح ربط و تعلق اور (۲) خدا کے کلمہ کو غالب کرنے کے لیے جدوجہد میں انماک۔ یہ دونوں چیزیں آپ کو اسلامی تحریک ہی میں مل سکتی

ہے۔ جو دین حق کو قائم کرنے کی عظیم جدوجہد میں مصروف ہے۔ میں اس بات کی وضاحت کرتا ہوں:

الف۔ سب سے پہلی حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تحریک آپ کو ایک مقصد کے لیے یک سو اور مطمئن کر دیتی ہے۔ اس کے بغیر زندگی میں شترگر بجی تو ہو سکتی ہے، لیکن مقصدی یک رنگی نہیں ہو سکتی، جو سیرت کی اصل بنیاد ہے۔

ب۔ اسلامی تحریک ہی یہ احساس ہاگزیز کرتی ہے کہ تم کو سیرت کی تعمیر کی خصوصی کوشش کرنی ہے۔ کیونکہ (۱) بحیثیت مسلمان تمہارے لیے دنیا اور آخرت میں کامیابی کا راستہ اور حقیقی فلاح و سعادت کے حصول کا ذریعہ یہی ہے۔ اور (۲) تحریک اسلامی کے کارکن کی حیثیت سے دنیا تمہارے پیغام کو تمہاری زندگیوں سے جانے اور پہچانے گی۔ تمہاری کتابیں تو وہ بعد میں پڑھے گی، تمہاری کتاب زندگی پہلے دیکھے گی۔

ج۔ اسلامی تحریک نیکی اور بھلائی کے جذبات زندہ رکھنے والے مطالعہ کے مواقع فراہم کرتی ہے اور کامیاب اسلامی زندگی کے خط و خال کو اجاگر کرتی ہے، تاکہ آپ اس معیار سے قریب تر آسکیں۔

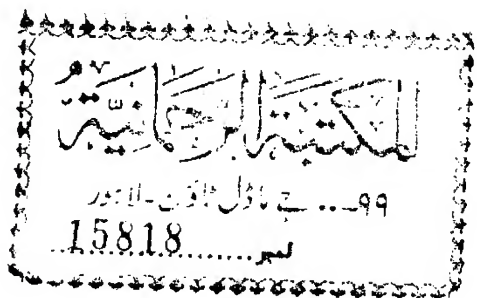
د۔ آپ کو بہتر اجتماعی فضا اور پاکیزہ ماحول دیتی ہے۔ جہاں آکر آپ اطمینان محسوس کرتے ہیں۔ جہاں آپ کو حقیقی رفاقت ملتی ہے۔ جہاں سب ایک ہی راہ کے راہی، ایک ہی قافلہ کے ساتھی اور ایک دوسرے کے لیے سہارا ہیں، جہاں گرفتار کو قتل کو تھما جاتا ہے، سست رفتار پلٹنے والوں کو تیز گامی ملتی ہے --- یہ طالبانِ خیر کی ایک چھوٹی سی دنیا ہے --- اور تعمیر سیرت کے لیے بہترین میدانِ کار۔

ه۔ پھر سہاں آپ ایک باقاعدہ نظم، ایک نظام امر و ابستہ ہوتے ہیں اور یہ نظم تربیت کا ایک بڑا موثر ذریعہ بن جاتا ہے۔ اس سے انسان کی پوری زندگی میں نظم و ترتیب اور منصوبہ بندی کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ چیز تعمیر سیرت کی جدوجہد میں بڑی معاون ہے۔

و۔ تحریک اسلامی انفرادی اور خصوصیت سے اجتماعی محاسبہ و تنقید کا بہترین ادارہ اور فورم فراہم کرتی ہے۔ یہاں انفرادی محاسبہ کی عادت ڈالی جاتی ہے۔ اور اجتماعی احتساب کے ذریعہ ایک دوسرے کو چوکس رکھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ اسلامی تحریک کے مخالفین اپنی تنقید اور بے لاگ لشرزنی کے ذریعے ہمیں چوکنا اور بیدار رکھتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں ہم اپنے کو اسلام کے معیار مطلوب سے قریب تر لانے کی کوشش تیز کر دیتے ہیں۔

ز۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلامی تحریک اس قافلہ حق کے راہیوں کو اس معرکہ حق و باطل میں لاتی ہے۔ یہ کارزار سیرت کے لیے وہی مقام رکھتا ہے جو سونے کو کندن بنانے کے لیے سنار کی بھیٹی۔

گویا اسلامی تحریک میں آپ کا ہر کام تعمیر سیرت کی کتاب کا ایک ورق ہے۔ معاملہ خواہ مطالعہ کا ہو یا درس و تدریس کا، تحریر کا ہو یا تقریر کا، کاروبار کا ہو یا معاملات کا، اپنے نصب العین کے لیے ملاقاتوں کا ہو یا اسلامی تحریک کی یا کسی ضرورت مند کی مالی اعانت کا۔ ان میں سے ہر ایک امتحان گاہ حیات کا ایک پرچہ ہے اور ترقی درجات کا ایک موقع۔ بشرطیکہ اس سے کوئی فائدہ اٹھائے۔



## انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

### چند اردو کتب اور جرائد

پاکستان میں نفاذ اسلام	خورشید احمد	۱۲۰ روپے	○
پاکستان، بھارت اور عالم اسلام	خورشید احمد	۸۰ روپے	○
جمہوریت، پارلیمنٹ اور اسلام	خورشید احمد	۲۱۰ روپے	○
پاکستانی سیاست اور آئین	خورشید احمد	۲۱۰ روپے	○
رودادِ قفس جلد اول	سید علی گیلانی	۱۲۰ روپے	○
رودادِ قفس جلد دوم	سید علی گیلانی	۱۲۰ روپے	○
کشمیر: نوائے حریت	سید علی گیلانی	۹۰ روپے	○
کشمیر: آزادی کی جدوجہد	مرتبہ: سفیر اختر	۲۵۰ روپے	○
مسئلہ کشمیر: کل، آج اور کل	مرتبہ: سلیم منصور خالد	۹۵ روپے	○
مسئلہ کشمیر: پاک، بھارت مذاکرات	مرتبہ: ارشاد محمود	۵۰ روپے	○
حرمتِ ربا اور غیر سودی مالیاتی نظام	محمود احمد غازی	۳۵ روپے	○
ربا اور بنک کا سود	یوسف قرضاوی	۳۰ روپے	○
جدید اقتصادی مسائل اور شریعت	البرکہ بنک	۳۰ روپے	○
اسلامی بنکاری: نظریاتی بنیادیں اور عملی تجربات	اوصاف احمد	۳۵ روپے	○
ماہ نامہ ”عالم اسلام اور عیسائیت“	مدیر: سفیر اختر (سالانہ)	۱۰۰ روپے	○
دو ماہی ”وسطی اشیاء کے مسلمان“	مدیر: الیاس خاں (سالانہ)	۵۰ روپے	○
ماہ نامہ ”دینی صحافت کا جائزہ“	مدیر: سجاد خاں (سالانہ)	۲۰۰ روپے	○